

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی مہکتل اور مستند و مقبول عام سوانح حیات

سیرۃ النبی

صلی اللہ علیہ وسلم

جلد پنجم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جلد پنجم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۶	نار تمام جہانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے	۲۳	تجدید حرکت لڑنے پر پابندی اور تکالیف		ویساچہ
"	نماز کی دعا	"	خاتہ عبادت نہیں		
۵۹	اسی دعا نے محمدی کاموں کو دوسرے انبیاء	۲۵	عزیز نشینی اور قطع ملائق عبادت نہیں		عمل صالح
"	کی منصوص دعاؤں سے	۳۰	اسلام میں عبادت کا وسیع مفہوم		"
۶۰	حضرت موسیٰ کی نماز کی دعا	۳۵	عبادات چارگانہ اعمال چارگانہ کا	۱۱	ایمان کے بعد عمل صالح کی اہمیت
"	زبور میں حضرت داؤد کی نماز کی دعا		عنوان ہیں۔	۱۵	اعمال صالح کی قسمیں
۶۱	انجیل میں نماز کی دعا			"	عبادات
۶۲	نماز کیلئے تعیین اوقات کی ضرورت		نماز	"	اخلاق
			۳۷	"	اطلاعات
۶۳	نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں	۴۲	توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم		
۶۴	نماز کیلئے مناسب فطری اوقات	"	اسلام میں نماز کا مرتبہ		عبادات
۶۵	اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ	۴۳	نماز کی حقیقت	۱۶	
۶۶	اسلام میں طریقی و اوقات نماز	۴۶	نماز کی روحانی طرف و غایت	۱۶	اسلام اور عبادت
۶۷	نمازوں کی پابندی و نگرانی	۴۷	نماز کیلئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت	۱۸	اسلامی عبادت کی خصوصیات
"	نماز کے اوقات مقرر ہیں	۴۹	ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے	۲۰	صرف ایک خدا کی عبادت
"	وہ اوقات کیا ہیں؟	"	نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے	"	خارجی رسوم کا وجود نہیں
	اوقات کی تکمیل	۵۰	نماز میں نظام وحدت کا اصول	۲۱	درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں
		"	نماز میں جہانی حرکات	"	خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں
۷۰	نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل	۵۱	ارکان نماز	"	مکان کی قید نہیں
۷۳	ایک نکتہ	۵۲	قیام	۲۲	انسانی قربانی کی مانعت
"	صح بین الصلواتین	"	رکوع	"	حیوانی قربانی میں اصلاح
۷۴	اوقات پنجگانہ اہدایت امر	"	سجدہ	۲۴	مفسرانہ قربانیوں کی مانعت

نام کتاب ————— سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مصنف ————— علامہ سید نعمانی و سید سلیمان ندوی

تاریخ طباعت ————— صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

تعداد ————— ایک ہزار

پریش ————— آر زیڈ پی بکس، لاہور

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۲۰	جانوروں پر زکوٰۃ	۹۹	مسلمان کا امتیازی نشان	۷۵	دلوک کی تحقیق
۱۲۱	غائب مال کی تعیین	۱۰۰	دائمی تنہا اور بیداری	۷۷	اوقات نماز کا ایک اور راز
	زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں		الفت و محبت		اوقات پنجگانہ کی ایک اور آیت
۱۲۲	اصلاحات	۱۰۱	علم خواری		اطراف النہار کی تحقیق
۱۲۳	دو مضر و مفسدوں میں ترجیح		اجتماعیت	۷۸	ایک اور طریقہ نبوت
	اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف		کاموں کا تنوع	۷۹	نماز پنجگانہ کا اصلیت و سنت میں
۱۲۴	ہشنگانہ	۱۰۲	تربیت	۸۱	تجدید نفل ہوگی، لیکن کیوں؟
	مسکینوں، فقیروں اور		نظم جماعت		قبلہ
۱۲۷	مفسدوں کی امداد	۱۰۳	مسوات	۸۷	رکعتوں کی تعداد
	غلامی کا امداد		مرکزی اطاعت	۸۹	نماز کے آداب باطنی
	مسافر		معیار نفیلت		اقامت صلوٰۃ
۱۲۸	جماعتی کاموں کے اخراجات کی صورت	۱۰۴	روزانہ کی مجلس عمومی		قنوت
	زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور		اصلاحات		خشوع
	اصلاحات	۱۰۵	تزکیہ نفس		تبتل
۱۲۹	باہمی امانت کی عملی تدبیر	۱۱۰	دولتمندی کی بیماریوں کا علاج	۹۱	تضرع
۱۳۰	اشتراکیت کا علاج		اقتصادی اور تجارتی فائدے		اطلاص
۱۳۲	فقراء کی اصلاح	۱۱۲	صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتاً لوجہ اللہ		ذکر
۱۳۱	صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتاً لوجہ اللہ	۱۱۳	ادا کیا جائے		فہم و تدبیر
	ادا کیا جائے	۱۱۶	صدقہ چھپا کر دیا جائے		نمانکے اخلاقی تمدنی اور معاشرتی فائدے
۱۳۳	بلند ہمتی اور عالی خیالی		بلند ہمتی اور عالی خیالی		ستر پوشی
	فقراء اور مسکین کی اخلاقی		فقراء اور مسکین کی اخلاقی		طہارت
۱۳۶	اصلاح	۱۱۸	نکتہ		صفائی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۰۷	خالص روحانیت	۱۷۷	یہ قربانی کہاں ہوئی؟		روزہ
۲۰۸	حج مبرور	۱۷۸	کہ اور کعبہ		۱۳۸
	جہاد	۱۸۰	حج، ابراہیمی یادگار ہے	۱۳۸	روزہ کا مفہوم
۲۱۰	جہاد کی تشریح	۱۸۳	حج کی حقیقت		روزہ کی ابتدائی تاریخ
۲۱۲	جہاد کی قسمیں	۱۸۵	حج کی اصلاحات	۱۳۹	روزہ کی مذہبی تاریخ
	جہاد اکبر		حج کے ارکان	۱۵۱	روزہ کی حقیقت
	جہاد بالعلم		احرام	۱۵۲	رمضان کی ماہیت
	جہاد بالمال		طواف	۱۵۳	فریضہ میام کا مناسب موقع
۲۱۳	ہر نیک کام جہاد ہے	۱۹۱	حجر اسود کا استلام		سلسلہ
۲۱۵	جہاد بالنفس	۱۹۲	صفا اور عرفہ کے درمیان دوڑنا		ایام روزہ کی تحدید
۲۱۶	دائمی جہاد		وقوف عرفہ	۱۵۵	ایک نکتہ
	عبادات قلبی		قیام مزدلفہ		روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب
۲۱۷	تقویٰ	۱۹۳	منی کا قیام	۱۶۰	حج میں اصلاحات
	اخلاص	۱۹۳	قربانی	۱۶۱	روزہ کے مقاصد
	توکل		حلق راس	۱۶۳	حائل قرآن کی پیروی
	صبر	۱۹۵	ان رسوم کی غایت	۱۶۵	شکریہ
	شکر	۱۹۶	حج کے آداب	۱۶۶	تقویٰ
	تقوٰے	۱۹۸	حج کی مصلحتیں اور حکمتیں		حج
۲۱۸	تقویٰ سارے اسلامی احکام کی	۲۰۱	مرکزیت	۱۷۲	کہ
	غایت ہے	۲۰۲	رزق خیرات	۱۷۳	بیت اللہ
	اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے	۲۰۳	قربانی کی اقتصادی حیثیت	۱۷۴	حضرت اسمعیل کی قربانی اور اس کے شرانگہ
۲۱۹	مستحق ہیں	۲۰۶	ابراہیمی دعا کی مقبولیت	۱۷۵	سلسلہ ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے
	کامیابی اہل تقویٰ کے لیے ہے	۲۰۷	تجارت	۱۷۶	اسلام قربانی ہے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعَزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

دستِ چہ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوئی تھی، آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گناہگار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے۔ اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسن قبول کے لیے کھول دیا ہے۔

موضوع | اس جلد کا موضوع عبادت ہے اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام و انواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصوحت و حکمت اور اس باب میں گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذاتِ پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطا کار ظلم نے لکھی اور بیان کی ہے، اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستے سے نہ ہٹے جو صراطِ مستقیم ہے اور وہ سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقی ہے۔ تاہم وہی کہتا ہوں جو بعض صحابہ اور اکابر نے (خلا ان سے راضی ہو) فرمایا کہ جو بات کسی گئی ہے اگر صحیح ہے تو خدا کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو نفسِ خطا کار کا قصور ہے۔

ان جلدوں کا سیرت سے تعلق | ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف منازعی اور سیر کے واقعات سے نہیں جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲۰	اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں	۲۳۵	صبر	۲۲۰	اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں
"	معیشت الہی سے سرفراز ہیں	"	"	"	"
"	قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے	۲۳۵	صبر کے لغوی معنی	"	قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے
"	تقویٰ والے کون ہیں؟	"	وقت مناسب کا انتظار کرنا	"	تقویٰ والے کون ہیں؟
"	تقویٰ کی حقیقت کیا ہے	۲۳۶	بے قرار نہ ہونا	"	تقویٰ کی حقیقت کیا ہے
۲۲۳	اسلام میں برتری کا معیار	۲۳۶	مشکلات کو خاطر میں نہ لانا	۲۲۳	اسلام میں برتری کا معیار
اخلاص					
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۸	درگزر کرنا	۲۲۳	۲۲۳
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۹	ثابت قدمی	۲۲۳	۲۲۳
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۹	ضبطِ نفس	۲۲۳	۲۲۳
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۲	ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فریضہ کو	۲۲۳	۲۲۳
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۲	ہیشہ ادا کرنا	۲۲۳	۲۲۳
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۲	صبر کے فضائل اور انعامات	۲۲۳	۲۲۳
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۵	فتح مشکلات کی کنجی، صبر اور دعا	۲۲۳	۲۲۳
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۵	توکل کے غلط معنی	۲۲۳	۲۲۳
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۵	توکل کے حقیقی معنی اور قرآنی تشریح	۲۲۳	۲۲۳
۲۲۳	۲۲۳	۲۳۵	توکل کے حقیقی معنی اور قرآنی تشریح	۲۲۳	۲۲۳

www.muhammadilibrary.com

کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے، صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دونوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا، سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔

اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حفصہ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا ان زبانی بیانات اور تلیقوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آجائیں یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، فرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلو پیڈیا اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا، گولہا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا (نام مولانا حبیب الرحمن خان شروانی ص ۱۰۳)

سیرۃ جلد اول کے مقدمہ میں انہوں نے ان حصوں کا عنوان "منصب نبوت" رکھا تھا اور لکھا تھا:-

"دوسرا حصہ منصب نبوت کے متعلق ہے، نبوت کا فرض تعلیم، عقائد، اور امر و نہی، اصلاح اعمال اور اخلاق ہے اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے اس حصہ میں فرائض خسرو اور تمام امر و نہی کی ابتداء اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کاتھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لیے کافی ہو سکتا ہے" (جلد اول طبع اول ص ۴، و طبع دوم ص ۹۷)

گذشتہ چوتھی جلد یا پانچویں جلد اور آئندہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہیں منصب نبوت، عرب کی گذشتہ حالت اور تعلیم عقائد چوتھی جلد کا موضوع تھی اور فرائض خسرو، ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہیں، اخلاق و معاشرت کے نقطوں کے لیے چھٹی جلد اور بقیلہ و امر و نہی کے لیے جو معاملات سے متعلق ہیں، ساتویں جلد ہوگی، ان میں سے ہر موضوع کی تفصیل و تشریح میں مصنف اول کے ایماء کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے۔ ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے، ان کی مصلحتوں اور حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبوں سے مناظرہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے اور وہ کیونکر تمام عالم کی اصلاح کے لیے کافی ہے۔

درپس آئینہ طوطی صفتہ داشتہ اند : آنچه استاد مرا گفت جان می گویم

حسن قبول | اللہ پاک کا نذر ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو حسن قبول کی سعادت عطا فرمائی۔

قبول خاطر دلہا خداداد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا، مجھ سے فرمایا یہ کتاب وہاں قبول ہوگی ان کے اس ارشاد کی

تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہو گئی۔ علاوہ اس کے کہ اس کی ہر جلد کے کسی کسی ایڈیشن شائع ہو چکے، ہندوستان، بیرون ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہو گئی، ترکی میں اس کی تین جلدیں کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا۔ فارسی میں اس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ کی گئیں اور اب تک منتظر طبع ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ معظمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے۔

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لیکر آج تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پر کوئی قابل توجہ کتاب نہ تھی، چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں نئے نئے دعوتوں کے ساتھ اس کو سامنے رکھ رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں بحمد اللہ پیدا ہو گیا ہے اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہو گیا ہے۔

امرائے اسلام کی امداد | اس کتاب کے حسن قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جو سنی شائع کیا اس کی خدمت کے لیے لیبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی، جس کا اثر انفس محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ تھا یعنی ملت محمدی کی خادمہ اور امت محمدی کی محدود تالیف المند نواب سلطان جہاں بیگم سابق فرمانروائے کشور بھوپال (خدا ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے، نومبر ۱۹۱۳ء میں مصنف کی وفات پر خیال گذرا کہ شاید یہ توجہ بجا ہوئی باقی نذر ہے مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لیے نہ تھا جو مرچکا بلکہ اس خدا کے لیے تھا جس کی موت نہیں، اس لیے اپنی شالہ زما ہوار امداد بلا برجاری رکھی، مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق کچھ لکھا تھا:-

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہٹے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر میرادل ہے میری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے، ایک سلطان ہے

جب اس فقیر بے نوا کی وفات ہوئی تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ "فقیر بے نوا تو چل بس، اب سلطان کی باری ہے۔ آخر یہ سلطان بھی چل بسی اور تالیف و تنقید روایت کے ساتھ ساتھ "زرافشاںی کے کام کی ناتامی کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جوان بخت کے سپرد کر گئیں جس نے فرائض حکومت کی گرا باری کے ساتھ ساتھ ابن کے تمام کارناموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھایا اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی، سکندر صوفی افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک تعالیٰ تازہ برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیر سایہ امت و ملت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں خلد اللہ ملکہ

۱۹۱۵ء میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپ کر شائع ہوئی تو جامع نے اس کا ایک نسخہ حضرت آصفیہ سابع مظفر الملک و الممالک نظام الدولہ نظام الملک سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کی پیشگاہ خسروی میں پیش کیا حضور مدوح کواپنے مولیٰ و آقا حضرت سرور کائنات، فخر موجودات سید المرسلین، محبوب رب العالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ الواف

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عمل ہے کہ انہیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں۔ جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ أَحْسَنَ تَقْوِيمٍ
شَوْرَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ
غَيْرُ مَمْنُونٍ (والتین: ۱)

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون لوگ بچائے جاتے ہیں، وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہے یہ وہی ہیں جو دعویٰ تھا کہ بہشت انہیں کے ٹھیکہ میں ہے، یہ فرمایا:۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
أَصْحَابُ الْجَنَّةِ (بقرہ: ۹)

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے۔ فرمایا:۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّالِحِينَ
وَالنَّاصِرِينَ مِنْ أُمَّةٍ بِإِذْنِ اللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَكُلٌّ مِمَّا لَمَّا نَدَّوْا وَخُوفٌ عَلَيْهِمْ وَذُرٌّ
يُخْذَتُونَ (مائدہ: ۱)

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل یا قومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب ملت کی طرف رکھی نسبت پر ہے بلکہ احکام الہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی، اور ایمان اور نیکو کاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ ذوالقرنین کی زبان یہ فرمایا:۔

قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نَعَذِّبُهُ شَوْرَدَدْنَا إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نَكْرًا
وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءٌ مِمَّنْ أَحْسَنَ (کہف: ۱۱)

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَلَا يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَإِنَّ لَهُ
كَاتِبُونَ (انبیاء: ۷)

(نیک عمل کو) لکھتے جاتے ہیں۔

توان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو برسا دیکھا اور انسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ گمراہی سے ملیں گے لیکن جس توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا سا حق بھی ملازہ جائیگا۔

خَلْفَ مَنْ كَبَدَهُمْ خَلْفًا أَضَاعُوا الصَّلَاةَ
وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غِيَاثًا
إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَذَلِكَ
يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يَبْتَغُونَ
شَيْئًا (مریم: ۳)

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل انہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آلاستہ ہیں اور جو عمل سے محروم ہیں، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں، الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
فِي رُفُقَاتِ الْجَنَّةِ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ
عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ
الْكَبِيرُ ذَلِكِ اللَّهُ يُبَشِّرُ اللَّهُ
عِبَادًا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
(شوری: ۳)

اور جو ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں یہی بڑی مہربانی ہے یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔
بیشک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کی مہمانی کے لیے باغ فردوس ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
كَأَنَّهُمْ جَدَّتِ الْغُرُودُ مِنْ تَوَاتُرِهِمْ
يُحْرَجُونَ (کہف: ۱۲)

تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ
عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ
أَحَدًا (کہف: ۱۲)

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے اسی کے بعد ایمان میں بھی کمزوری ہے، کسی چیز پر پورا پورا یقین آجانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے لیکن نادان بگم جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا، وہ بار بار اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو ہو جاتا ہے اس لیے عمل کا قصور بہتر یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے۔
فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ (مائدہ: ۷)

تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ آگ کے باغوں میں ہوں گے۔

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۳۵ موقعوں پر یہ آیت ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے۔

اس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نجات اور فوز و فلاح کا مددگار دونوں پر یکساں ہے البتہ اس قدر فرق ہے کہ تہہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے، جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے خدا نے وعدہ

لَيَسْتَخْلِفَنَّ فِي الْأَرْضِ (نور: ۷۷)
کیا کران کو زمین کا مالک بنائے گا۔

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انہی سے تھا۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور

مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (فتح: ۴۰)
نیک کام کی بخشائش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا۔

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نیکواری کو جگہ دی گئی ہے مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے۔ فرمایا :-

بَلْ مِنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ
کیوں نہیں جس نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کیا اور ن

فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
نیکو کام ہے تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس

وَلَا هُمْ يُخْزَنُونَ (بقرہ: ۱۷۷)
ہے، نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے۔ اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔ عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط میں ہے صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکو کاری سے نجات کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے مگر غیر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہے اس کو ایمان کہتے ہیں، پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہیں دو باتوں پر ہے، کوئی مریض صرف کسی اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لیے کافی نہیں جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
وہ ایمان لائے اور نیک کام کیے۔

صَلَاتِهِمْ وَخَشَعُوا أَصْوَاتَهُمْ
انہوں نے نماز کی طرف رخ نہیں کرتے، جو رکوع

اللَّغْوِ وَمُرْسُوكَ وَالَّذِينَ هُمْ لِلذِّكْرِ كَافُونَ
دیتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت

فَاعَلَوْا كَذَلِكَ هُمْ كَافِرُونَ
کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد

وَالَّذِينَ لَا مَنَّةَ لَهُمْ وَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ
کا پاس کرتے ہیں۔ جو اپنی نمازوں کے پابند

هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ أُولَٰئِكَ هُمُ
ہیں۔ یہی بہشت کے وارث ہیں۔

الْمُؤْتَمِنُونَ (مومنون: ۱۱)

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی عمل و اسباب کے تابع فرمایا ہے، یہاں کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے، صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے ہماری بھوک دفع نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے ہم کو جدوجہد کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا۔ اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لپاتی ہیں، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں۔ یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لیے بیکار ہے البتہ قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہر حال بہتر ہے جو ان کو سرفہ نہیں مانتا کیونکہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آنے اور نیک عمل بجالانے کی امید ہو سکتی ہے اور دوسرے کیلئے تو اول پہلی ہی منزل باقی ہے اس لیے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔

اعمال صالحہ کی قسمیں | عمل صالح کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمال خیر کے تمام جزئیات

داخل ہیں، تاہم ان کی جلی تقسیمات حسب ذیل ہیں، عبادات، اخلاق، معاملات۔

اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے، اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی

خوشنودی ہو۔ اس لیے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کیے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں مگر

فقہاء نے اصطلاحاً تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیے ہیں جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولاً اعمال صالحہ

کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے اس کو عبادت کہتے ہیں، دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے

ہے اس کی بھی دو قسمیں، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی

ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے، پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمال صالحہ کی انہیں تینوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرت النبی کی موجودہ اور آئندہ جلدوں کا موضوع ہے۔

عبادات

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ (بقرہ: ۳)

عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال کبھی جلتے ہیں جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریا کی بارگاہ میں بجا لاتا ہے لیکن یہ عبادت کا نہایت تنگ مفہوم ہے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے، ساتھ ہی عبادت کے گذشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل، مبہم بیانات کی تشریح اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔

اہل عرب جہاں آسمانی مذاہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے، عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبادت میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے ناپرواہہ کر کے بڑے سلسلے کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جہود و جادو سحر و کوشش کے میدانوں سے بہت کرمجرا اور متعشقانہ زندگی بسر کرتے تھے اسی لیے عربوں کی شاعری میں عبادت کا خیال ایک راہب متبتل کی صورت میں تھا، عرب کا سب سے بڑا شاعر امرء القیس کہتا ہے۔

منارۃ مسیٰ راہب متبتل دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کا نام پورا

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدظلیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خدا پرستی نام کو نہ تھی وہ صرف نسبت (سینچر) کے دن تو رات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے، یہودیوں پر اس نے بے حکمی، نافرمانی، اکل حرام اور طافوت کی پریشانی کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے۔

یہودی جادو، ٹوٹکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا، غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکالیتے تھے، عیسائی حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ اور سیسی اولیا اور شہیدوں کی تصویریں مجسموں یا دکاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے، انہوں نے راہبانہ عبادت کے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کیے تھے اور ان کا نام انہوں نے دیناری رکھا تھا، سورہ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے لیکن

دیکھو سورہ مائدہ رکوع ۱۱۰، ۱۱۱ اور سورہ حدید رکوع ۴

ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے۔ یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا، اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں، اسی لیے قرآن نے دونوں کو بڑا برا فسق قرار دیا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا قَارِئًا بِهَيْمٍ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمُ النَّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ لِيُنذِرَ لِقَوْمِهِمْ إِسْرَافَهُمْ فَسَقُوا، ثُمَّ تَقَلَّبْنَا عَلَى آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهَابِيَّةً بَاتَتْ عَنْهَا مَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ (آلہ) اِبْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرًا مِّنْهُمْ فَسَقُوا (حدید: ۴)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرکب ہوئے اسی لیے قرآن نے ان کو بار بار کہا۔

لَا تَخْلَوْا فِي دِينِكُمْ (سورہ مائدہ: ۱۰) اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ ان کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا وہ ابن اللہ ماننے لگے اور یہودیوں کا عقائد تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے بلکہ انکو قتل کرتے تھے وَ يَقْتُلُونَ النَّبِيَّاتِ (بقرہ: ۲۱۷) ساتھ ہی وہ خدا نے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمایہ قوموں کے بتوں کو پوجنے لگے تھے، چنانچہ تورات میں یہودیوں کی تہ پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے اور قرآن میں ان کے متعلق ہے۔

وَعَبَدُوا الطَّاغُوتَ (مائدہ: ۹) اور جنہوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا۔

اَسْفَرَتْ صِلَى اللّٰهِ وَسَلْمَ تَعِيَسَايُوتِ كُو تَبْلِيغِ كِي مَا الْمَسِيحُ بِنُ مَرْيَمَ رَاوَرَسُولٌ قَدْ خَلَقْنَا مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلَ وَاُمَّةً وَّوَدَّ يَهْدِيهَا كَمَا نَا يَا سَكُلِيْنَ الطَّغَاةُ اَنْظُرْ كَيْفَ نَسَبْنَا لَهُمُ الْاٰذِيَّةَ لَمَّا اَنْظُرُوْا اَنِيْ يُؤْتِكُوْنَ قُلُوبًا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمُ ضَرًا وَّ لَا نَفْعًا وَّ اللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ . قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا اَهْوَاَ قَوْمٍ تَدْرُكُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَاَنْتُمْ اَكْتَبُوا وَّ صَلُّوا عَن سُوَابِ السَّبِيْلِ (مائدہ: ۱۰)

مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس۔ اس سے پہلے پیغمبر گندھکے اور اس کی ماں ولی تھی۔ دونوں انسان تھے، کھانا کھاتے تھے (خدا نہ تھے)، دیکھ ہم ان (عیسائیوں) کے لیے اس طرح کھول کر دیلیں بیان کرتے ہیں پھر بھی دیکھ کہ ہرگز جلتے ہیں (ان سے) کہہ کر کیا تم خدا کو چھوڑ کر ان انسانوں کو پوجتے ہو جن کے ہر تھ میں نقصان ہے نفع اللہ ہی سننے والا اور بھلنے والا جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے کہہ لے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو جسکے گے اور بتوں کو بھکایا

اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

ان کی حالت یہ تھی :-

اَتَّخَذُوا اَحْبَابًا لَهُمْ ذُرُوبًا لَهُمْ اَزْبابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ (توبہ: ۵)

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستشگاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں تھیں، ان میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے۔ عبادت گزاران کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سر بسجود رہتے تھے۔ مجاہد میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثناء میں ان مجسموں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ان میں سے شاید بعض بیسیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں بعض ازواج مطہرات نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حسن و خوبی کو بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا ہیود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔ ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مر جاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کر دیتے تھے۔

ایڈورڈ گین نے تاریخ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادت کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ تمام حدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم سینٹ پال اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے درو دیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آدائیں آرہی ہیں، اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات مونی بیٹوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔ روم (اطلی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

یسودیوں اور عیسائیوں کو عجیب و غریب خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بے خبر تھے، لات، سزئی، ہبل اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے ان پر جانور قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو ہیمنٹ چڑھاتے تھے سال کے مختلف اوقات میں مختلف بستہ خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے جازہ کعبہ یعنی خلیل بت شکن کا معبد میں سوساٹھ بتوں کا مرکز تھا اور ان کی ناز پر تھی کہ خانہ کعبہ کے ضمن میں جمع ہو کر سٹی اور تالی بجا بجا کرتوں کو خوش اور راضی رکھیں۔ قریش کا متحد زید بن عمرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ اے خدا! مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں، اگر جانتا تو اسی طرح

سے صحیح مسلم کتاب مساجد :-

عبادت کرتا :-

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر میں یہ ترانہ گایا ہے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے :-

واللہ لولانت ما اھتدینا
خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے

ولا تصدقنا ولا صلینا
نہ خیرات کرتے اور نہ سزا پڑھتے

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا کیا۔
عرب سے باہر بھی کہیں خدانے واحد کی پرستش نہ تھی، بت پرست یونانی اپنے بادشاہوں اور ہیردوں کے مجسمے اور بتوں کے ہیکل پوجتے تھے۔ روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور بڈیاں اور ان کی مصنوعی یادگاریں پوجی جا رہی تھیں۔ ہندوستان میں آگ کی پرستش جاری تھی، ہندوستان سے لیکر کابل، ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتوں کا دھوا اور اس کی جلی ہونی بڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی۔ چین کے کنفوشس اپنے باپ دادا کی مورتوں کے آگے خم تھے، خاص ہندوستان میں سورج دیوتا، گنگامانی اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی۔ عراق کے صحابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے۔ باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی۔ مغرب عین اس وقت جب تمام دنیا خدانے واحد کو چھوڑ کر، آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مہر دہ تھی ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ
وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ: ۲۱)

لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔

سابق کتب الہی کے ایما نداروں کو آواز دی گئی :-
يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ
رآل عمران: ۷۰

اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر علامت متحد ہو جائیں جس میں ہم تم عطیہ متفق ہیں کہ ہم خدانے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی اور پکارا تھے :-
رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا نَادَىٰ يَٰ دِيبَانُ
اِنَّ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاَمَّا نَاقِ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا
ذُنُوْبَنَا رآل عمران: ۲۰۰

خداوند! ہم نے ایمان کے سدا کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے تو اسے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر۔

ان واقعات کو سامنے رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کر جو بدر کے امتیاز گاہ میں پکی

سیرت ابن ہشام ذکر زید بن عمر سے صحیح مسلم باب خیبر، شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتوں میں مختلف ہے :-

زبان عبودیت ترجمان سے بارگاہ الہی میں کی گئی تھی۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو جسے والوں کی یہ منہی بھر جماعت آج تمہارے لیے لڑنے پر آمادہ ہے، خداوند آج اگر یہ منہ گئی تو پھر زمین میں کبھی تیری پرستش نہ ہوگی۔

خدا نے اپنے نبی کی دعائی اور قبول فرمائی کیونکہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا کی کچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت | مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوت محمدی کا پہلا کانامہ ہے کہ اسے دنیا کے معبودوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال پھینک دیا۔ باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کر دی اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں اور صاف اعلان کر دیا کہ :-

ان کل من فی السموات والارض اِلٰہ اِلٰہی التَّحِيَانِ عَبْدًا (مریم ۶۰)
آسمان اور زمین کی تمام مخلوق اس صربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔

خدا کے سوا تو آسمان میں، زمین میں، نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے بچہ اور رکوع و قیام کی مستحق ہے اور نہ اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جاسکتا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لیے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جاسکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جاسکتی ہے اور نہ اس سے دُعا مانگی جاسکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لیے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے۔

ان صلاقی و نسکی و محیائی و منافی باللہ
بے شبہ میری نمانا اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار کا نام لیتے ہیں؟

کفار کو بتوں دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے بگھایا گیا کہ خدا نے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں لیکن جب ان پر اس بگھانے بگھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا۔

قل یا ایھا الکفرین لا اعبدوا ما تعبدون
اولا انتم عبیدون ما اعبدوا اولادنا عابد
ما اعبدوا اولادنا انتم عبیدون ما اعبدوا
لکفر دینکم ولی دینکم (کافرون ۱)
اے کافرو! جسکو تم پوجتے ہو اسکو میں نہیں پوجتا، اور تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں اور میں اس کو پوجنے والا ہوں جس کو تم نے پوجا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔

خارجی رسوم کا وجود نہیں | خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، نہ سونے کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا میں جا کر اسکا پانی اچھالنے سے طلب، نہ سامنے آگ کا ادا جلانے

سے صحیح مسلم اور جامع ترمذی، غزوہ بدر سے جیسا کہ ہندوؤں میں ہے :-

کی ضرورت نہ دیوتاؤں، دیویوں، بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت، نہ سامنے موم قبیلوں کے روشن کرنے کا حکم نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت، نہ لوہان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف، اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید۔ ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے، اس کے لیے صرف ایک پاک ستروپن لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں | اسلام میں عبادت کے لیے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خانلن اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانی کی حاجت نہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں نہ پررہت ہیں، نہ پجاری ہیں، نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں، نہ ربی ہیں نہ خا خا م ہیں، نہ حضرت ابروٰن کے خانلن کی وساطت کی قید ہے نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لیے پادریوں اور مختلف مذہبی عمدہ داروں کی ضرورت ہے اور نہ پارسیوں کی دستوروں اور موبدوں کی حاجت، یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتیں کرتا ہے، آپ عرض حال کرتا ہے۔ ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو، میں جواب دوں گا۔

ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مومن ۶۰) تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔

خارجی کشتی کی کوئی چیز نہیں | اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش، دلفریب، مؤثر اور بارعب بنانے کے لیے عجیب و غریب تاثیرات سے کام لیا تھا، کہیں ناقوس اور قرنا کی بارعب آوازیں تھیں، کہیں ساز و ترنم اور نغمہ و بزم کی دلکش صدائیں تھیں، کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور، لیکن دین محمدی کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لیے دل کے ساز اور روح کی صلا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیروں کا سہارا نہیں لیا تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں | ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چوڑے کی چھار دیواری میں محدود کیا ہے بت خانوں سے باہر پوجا نہیں، آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے میں نہ کسی درو دیوار کی ضرورت، نہ محراب و منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم، مسجد و صومعہ اور مسجد و کینہ سب سے بے نیاز ہے۔ زمین کا ہر گوشہ نہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبود اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔ بجز ان کے ایک یہ ہے۔

وجعلت لی الارض مسجداً | اور میرے لیے تمام روئے زمین مسجد گاہ بنا دی گئی۔

جیسا کہ پارسیوں میں ہے ۱۲ لے جیسا کہ ہندوؤں عام بت پرستوں رومن کیتھولک میں ہے جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیوں میں ہے جیسا کہ یہودیوں میں ہے پارسیوں میں سفید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے بخاری کتاب الصلاة باب قول النبی جعلت لی الارض مسجداً و طہوراً :-

تم سوار ہو کر پیادہ ہلکتے چمن میں ہو کر ہنگامہ کارزار میں، خشکی میں ہو کر تری میں، ہوا میں ہو کر زمین پر، جہاز میں ہو کر ریل پر ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدہ نیاز بجا لاسکتے ہو یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے لیے معبد میں ہو جس میں سامنے بت اور مجھے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضہ عبادت ادا کر سکتے ہو بلکہ

خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک واحد رخ پر مجتمع کرنے کے لیے تاکران میں وحدت کی شان نمایاں ہو، مسلمانوں کے لیے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی اور اس کے لیے اسلام میں مسجد ابراہیمی کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے لیکن اس کی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے، اسلام کا قبلہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی حدود سے پاک ہے وہ ستاروں کے رخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہیں، دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رخ کرتے ہیں، مغرب سے بھی، مشرق سے بھی، شمال سے بھی اور جنوب سے بھی، کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانہ کعبہ کے صحن میں بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اس کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی تہ نہ لگ سکے تو جدھر بھی رخ کروادھر ہی خدا ہے چنانچہ کسی جلتی ہوئی سواہی پر سفر کر نیکی حالت میں اور عام نفل نمازوں کی درستی کے لیے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں، جدھر سواری کا رخ ہو ادھر ہی سجدہ کیا جاسکتا ہے۔ لڑائیوں میں ہر رخ پر نماز برابر ادا کی جاسکتی ہے اگر خدا نخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے تب بھی اس رخ کھڑا ہو جانا کافی ہے۔ کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چلوں ہر جگہ دو۔

انسانی قربانی کی ممانعت | بعض مذاہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کھونٹ کر یا دریا میں ڈبا کر یا آگ میں جلا کر یا کسی اور طرح سے بھیڑ چڑھا دے اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی سہانی کی حمایت میں، یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پر واہ نہ کی جائے اور مارا جائے، یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے یا دریا میں ڈوب مر جائے یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائے گی۔

حیوانی قربانی میں اصلاح | کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا عرب میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے، کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لاکر باندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے۔ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ قربانی ذبح کر کے مسجد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ دیتے تھے، یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور ذبح کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے اور اس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے، ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے۔

۱۔ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیت ۱۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر افاہ ۵

بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت چیل اور کودوں کو کھلا دیتے تھے۔ پیغام محمدی نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا، ان سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں بلکہ تمہارے دلوں کی غذا مطلوب ہے۔ فرمایا:-

لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآئُهَا وَلَكِنْ يَنَالَهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ (رج: ۵)

اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

اسلام نے تمام عبادت میں صرف حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہل استطاعت کے لیے، جو موقع حج پر نہ گئے ہوں، مقام حج کی یاد کیلئے قربانی مسنون کی گئی ہے تاکہ اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملت عین فی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا اور خدا نے اس کو آزمائش میں پڑھا ہوتا دیکھ کر اس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دُنبے کی گردن رکھ دی اور اس کے پیروؤں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ پیام محمدی نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، جان کا فائدہ دنیا یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصد دو ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اجر احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے جانوروں کو، ہماری ضرورتوں میں لگایا اور ان کو ہماری غذا کے لیے مہیا کیا اور دوسرا یہ کہ ان کا گوشت، غریبوں، مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ چنانچہ فرمایا:-

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لَّذِكْرُوا اسْمَ اللَّهِ
لِي مَآرَئِهِمْ مِمَّنْ كَبِهَيْمَةَ الْأَنْعَامِ فَالْهَكُو
اللَّهُ وَاحِدٌ فَلَمَّا اسْلَمُوا وَابْتَشَرُوا الْمُحْبَبِينَ
(رج: ۵)

ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی مقرر کی تاکہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں جو حج ان کو روزی کی، تو تمہارا خدا ایک خدا ہے، اسی کے گے سر جھکاؤ اور عاجزی کرنے والے بندوں کو خوشخبری سنا دے۔

اور قربانی کے جانوروں کو خدا کی نشانیاں بنایا ہے تمہارے لیے ان میں بہت فائدہ ہے انکو نظار میں کھڑا کر کے تم ان پر خدا کا نام لاؤ جب سبیل کے بل جھکیں (یعنی ذبح ہو گئیں، تو ان سے کچھ نہ کھاؤ اور باقی قنات پسند فقیروں اور محتاجوں کو کھلا دو، اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارا کام میں لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے وَمَا أَهْلُ بَيْتِهِ لِيَخْرُجُوا مِنْهَا عَرَبٌ مِّنْ دُونِهَا خَاصَّ رَجَبٍ كَيْفَ مَنَعْتُمْ قُرْبَانِي كَرْتُمْ تَعْتُمْ، اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپ سے پوچھا، آپ نے فرمایا خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرو، نیک کام خدا کے لیے کرو اور (غریبوں کو) کھلاؤ۔ غرض قربانی کی یہی حقیقتیں ہیں، صرف خون بہانے کے لیے خون بہانا شرکوں، بیچاروں اور دیوانوں کی طرح اسلام کے دشمنوں کا کام ہے۔

مشرکانہ قبرانیوں کی ممانعت | اسی لیے وہ تمام مشرکانہ قبرانیاں جو عرب میں جاری تھی، منکرو دی گئیں، عرب میں جانوروں کے قربانی کرنے اور انکو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے، اونٹنی کا پھل، کچھ جو پیدا ہوتا تھا بتوں کے نام پر ٹھوسا سکی قربانی کر دیتے تھے اور اسکی کھال کو درخت پر لٹکادیتے تھے۔ اس قسم کے بچے کو فریضہ کہتے تھے۔ جب کے پہلے عشرہ میں ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی جسکا نام سترہ تھا، اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا اور جب تک انھیں باطل کر دی۔

قال لا تسرع ولا عتیروۃ
توں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور بھڑے جاتے تھے اور انکو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی :-

مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنَ الْجَنْبِیَّةِ وَالْمَسْأَبِیَّةِ
وَلَا وَصِیْلَةٍ وَلَا حَامٍ (مائدہ: ۶۳) عام بنایا۔

مردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرنے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحیں کیں اس کے سلسلہ میں اس کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا :-

لا عقرب فی الاسلام

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی و سخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابلہ کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے، اپنا ایک اونٹ یا بکری ذبح کرنا پھر اس کے مقابل میں دوسرے ذبح کرتا۔ اس طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جسکے اونٹ ختم ہو جاتے یا ذبح کرنے سے انکا کردیا وہ ہاجاتا۔ اسلام نے اس جان مال کے اتلاف کو روک دیا۔

تجرہ، ترک لذائذ، ریاضات اور تکالیف شاقہ عبادت نہیں | عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے آپ کو تکلیف اٹھاتا ہے اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے، اس لیے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی

تکلیفیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا اسی طرح روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی لائے گی چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیت اور ہندوؤں میں جوگ، اس اعتقاد کا نتیجہ تھا، کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا، کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سر تا پا برہنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا رنگ سمجھتا تھا، کوئی جلہ کی سردی میں اپنے جسم کو ننگا رکھتا تھا، کوئی ٹمر بھر یا ساہا سال تک اپنے

کو کھڑا رکھتا تھا یا بیٹھا رہتا تھا اور سونے اور لہسنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ سوکھ جائے، کوئی ٹمر بھر تا ایک تہہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد اور ترک دنیا کر کے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا لیکن نبوت محمدی نے یہ راز آشکار کیا کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترک لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے نہ ہاری تکلیفی خدا کی خوشنودی

۱۔ ابوداؤد کتاب الاضاحی، ج ۲، ص ۵۔ ابو داؤد کتاب الجنائز باب کرامیۃ الذبح عند البقر ج ۷، ص ۳۸

۲۔ ابوداؤد، کتاب الاضاحی، ج ۲، ص ۵۔

کاباوت ہے اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت ذہیب ہوتی ہے نہ ترک دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے۔ خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کا اندر ہے۔ اس نے کہا :-

لَا یُکَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (بقرة: ۲۸۴) خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (کم نہیں دیتا۔ اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضوں کے لیے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں، اسلام نے اس میں متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا :-

یُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرة: ۲۳۳) خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔ حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا تو ساتھ ہی فرمایا :-

مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا رَأَى الْكَلِمَةَ الْكَلِيمَةَ (۱۰) جسکو زیادہ اور چلنے کی استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (حج: ۱۰) تمہارے لیے دین میں اس نے (خدا نے) تکلیف نہیں کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

ان هذه الدين يسر ولن يشاد الدين احد الا غلبه
یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا اور فرمایا :-

انما انا بعثت بالملحة السمحة او السهلة
میں تو سہل اور آسان روشن صیغی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔

ذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو تاہم وہ دین حق کی اصلی تعلیم نہ تھی اس لیے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا اور کہا :-

وَرَهْبَانِيَّةٍ ابْتَدَعُوا غَوَّاهَا نَا كَتَبْنَاَهَا عَلَيْهِمْ سَوْا
اور عیسائیت نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور ہم انکو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا تھا، تو عیسائیت اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا۔

ان لوگوں سے جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لیے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا :-

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ
پوچھ لے پیغمبر کہس زیب و زینت اور زینت کی اچھی چیزوں کو جسکو خدا نے اپنے بندوں کے لیے بنایا، کس نے حرام کیا؟

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیبیوں کی خوشنودی

کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا، انہوں نے آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت، آپ تو معصوم ہیں، ان میں سے ایک صاحب نے کہا میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا، دوسرے صاحب نے کہا میں بھر روزے رکھوں گا، تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں بھر بھر مجھ پر روزوں کا کبھی نکاح نہ کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکی یہ گفتگو سن رہے تھے، ان کو خطاب کر کے فرمایا: خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میری جماعت میں نہیں ہے۔

بعض صحابہ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرادیں، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی، حضرت سعد بن ابی وقاص وغیرہ صحابہ کہتے ہیں، اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت لوگ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمام، طبع کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہم و مقصود تعلیم فرمایا۔ آپ نے کبھی کبھی بذات خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے، صحابہ نے بھی آپ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے، آپ نے منع فرمایا لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں اس لیے انہوں نے انظار نہ کیا، آپ نے دو دن روزے رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا، آپ نے انظار کر لیا اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا، تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا۔ صحابہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں؟ فرمایا: تم میں سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں عام امت کے لیے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گذر ہوا، دیکھا تو ایک کعبے میں ایک سی ٹنک رہی ہے، دریافت کیا تو لوگوں نے کہا یہ زینب نے باندھی ہے، رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سارے کھڑی ہوتی ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا یہ رسی کھول دو، لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم میں نشاط باقی رہے جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے۔

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گزری، حضرت عائشہ نے کہا یہ خولا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھر نہیں سوتی، اور عبادت میں مصروف رہتی ہے، فرمایا کہ یہ رات بھر نہیں سوتی، لوگو! اسی قدر کہ جو جتنی طاقت ہے۔

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے ہیں، ان کو مخاطب کر کے فرمایا: اكلفوا من العمل ما تطيقون فان الله لا يمل اتے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جسکو کر سکو کیونکہ جب تک

۱۔ صحیح بخاری کتاب النکاح ۲۔ صحیح بخاری والوداؤد کتاب النکاح ۳۔ صحیح مسلم کتاب الصوم ۴۔ صحیح الفوائد بحوالہ جمع کیر واسطی والوداؤد، عن انس ج ۱، ص ۲، طبع میرٹھ باب الاقتصاد فی الاعمال ۵۔ صحیح الفوائد بحوالہ صحیحین وموطاؤد نسائی ۶۔

مزاج کے لیے شہد کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر مقاب آیا، خدا نے فرمایا: ۱۔
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ
تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ
عَفُورٌ رَحِيمٌ (تحريم ۱۰)
بے پیغمبر! خدا نے جس چیز کو تیرے لیے حلال کیا تو اس کو
اپنی بیویوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا
ہے۔ اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

صحابہ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر، یا ذاتی میلان طبع کے سبب تجرد، ترک لذائذ اور ریاضات شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ میں یہ شریعت لیکر نہیں آیا۔ قدائم بن منظور اور ان کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجھ پر ہنپے اور شادی نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں، یہ شکر و دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ عمد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اے عبداللہ! تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے اسی قسم کی نصیحت آپ نے ایک دوسرے نقشبند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی، آپ کو ان کی نسبت معلوم ہو گیا وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں، بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہیں، رات کو سوتے نہیں، آپ نے ان کو بلایا اور پوچھا کہ کیوں عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے، عرض کی خدا کی قسم! میں نہیں ہٹا ہوں، میں آپ ہی کے طریقہ کا طلبگار ہوں، فرمایا میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور انظار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اے عثمان! خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو انظار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔

قبیلہ ہاجر کے ایک صحابی جب اسلام لاکرا اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انہوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے، ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ انکو پہچان نہ سکے، انہوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا: تم خوش رو تھے، تمہاری صورت کیوں ایسی ہو گئی؟ عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں، فرمایا: تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈال رکھا ہے؟ علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے! انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی تو آپ نے مہینہ میں دو روزوں کی اجازت دی، انہوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ میں تین روزے کر دیے، انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی تو آپ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دی، ایک دفعہ جب صحابہ نے ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا، وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ صحیح بخاری کتاب الصوم ۲۔ ایضاً البوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یؤمر بہ من الصلوٰۃ ۳۔ البوداؤد باب موسم اشہر الحرم

حتى تملوا فان احب العمل الى الله
تم ذاکا جاؤ، خدا نہیں آگاتا، خدا کے نزدیک پسندیدہی
کام ہے جس کو تم ہمیشہ کر سکو اگرچہ وہ تنوڑی ہی ہو۔

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں۔ بعض حاجی یہ منہ کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے
کچھ نہ بولیں گے یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے یا اس سفر میں
کسی سار کے بغیر و سوپ ہی میں چلیں گے، بعض لوگ اپنی گندگاری کے اظہار کے لیے اپنی ناک میں نیل ڈال کر طوفان کرتے
تھے اور اس کو ثواب جانتے تھے، اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کر دیا کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث
نہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر کی بہن نے یہ نذرمانی تھی کہ وہ پیدل حج کریں گی، عقبہ نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ
پوچھا، آپ نے جواب دیا خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں، ان سے کہو کہ وہ سواری پر حج کریں۔ اسی طرح
آپ نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے، آپ نے اس کو سوار ہونیکا
حکم دیا، اس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، آپ نے فرمایا میں جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے لیکن تم اس پر
سوار ہو لو۔ ایک دفعہ حج کے سفر میں آپ نے ایک بڑھے کو دیکھا جو خود چل نہیں سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونوں
طرف سے پکڑ کر چلا رہے تھے، آپ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے فرمایا خدا کو
اس کی حاجت نہیں کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب میں ڈالے، اس کو سوار کر دو۔

ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلپاتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے، آپ نے پوچھا کہ
کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے، لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابواسرہیل ہے، اس نے نذرمانی ہے کہ وہ کھڑا
رہے گا بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر رونے رکھے گا، آپ نے فرمایا کہ اس
سے کہو کہ بائیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے۔

حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نیل
پکڑ کر کھینچ رہا ہے آپ نے جاکر نیل کاٹ دی اور فرمایا کہ اگر ضرورت ہو تو تم پکڑ کر اس کو طوفان کراؤ۔

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دکھا کر آپ نے فرمایا :-

لا تشدوا علی انفسکونما هلك من
کان قبلکون تشدید هو علی انفسهم
وستجدون بقایا هو فی الصوم والدیارات
بھی گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے
ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، آپ نے فرمایا :-

۱۔ البعداؤد باب القصد فی الصلوة ۲۔ البعداؤد مسند ابن ماجہ کتاب الایمان والنذور ۳۔ صحیح بخاری ج ۱، ص ۸۲ ۴۔ البعداؤد ترمذی
ونسائی وابن ماجہ کتاب الایمان والنذور ۵۔ صحیح بخاری، البعداؤد وابن ماجہ کتاب الایمان والنذور ۶۔ صحیح بخاری کتاب الایمان
والنذور ۷۔ صحیح الترمذی کتاب الایمان والنذور ۸۔ البعداؤد وابن ماجہ کتاب الایمان والنذور ۹۔ باب الاقتصاد فی الاموال ۱۰۔

لا صرورت فی الاسلام (ابوداؤد)

اسلام میں رہبانیت نہیں۔

عزالت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں

کسی غار، کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے، اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں
قرار دیا۔ عبادت و حقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس
بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق
سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں، اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے ازدحام اور
علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اس کو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان
تعلقات و علائق اور حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشہ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامرد
اور بزدل سپاہی ہے، اسلام اپنے پیروؤں کو جو افراد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے جو ان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولتا
غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترک فرض نہیں بلکہ نئے فرض ہے، ترک عمل نہیں بلکہ عمل کچھ نہ کرنا نہیں، بلکہ کرنا ہے۔

ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ان صحابہ کو جو اہل عیال اور دوست و احباب سب
کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے۔ فرمایا: اے فلاں! تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی
بچوں کا بھی حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، اس سے
ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر میں عبادت ان حقوق کو بجا لانا ہے، ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ
میں ایک صحابی کا گدرا ایک ایسے مقام پر ہوا جس میں موقع سے ایک غار تھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا، اس
پہلے کچھ جنگل کی بوٹیاں بھی تھیں، ان کو اپنی عزالت نشینی کے لیے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ خدمت بابرکت میں آکر
عرض کی یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار ملے گی جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں، جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر
ہو کر ترک دنیا کر لوں، آپ نے فرمایا: میں یہودیت اور عیسائیت لیکر دنیا میں نہیں آیا ہوں میں آسان اور سہل اور
روشن ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہوں۔

اسلام سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادت الہی میں مصروف
رہتے تھے لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپ کے پاس آیا اور دعوت و تبلیغ کا بار آپ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا
شب و روز میں رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند اخیر دن گوشہ عزالت اور زاویہ تنہائی میں بسر ہوتے
تھے اور تمام دن پوری جماعت کیساتھ منکر خالق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلفاء
اور عام صحابہ کا طرز عمل رہا اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادی عبادت تھی۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم | اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں
جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درمانگی کا اظہار ہے اور اصلاح شریعت میں
۱۔ مسند ابن جبلی ج ۵، ص ۲۶۶ ۲۔ اسلام میں گوشہ گیری اور عزالت نشینی کی اجانت صرف دو موقعوں پر ہے۔ ایک اس شخص کے لیے
جس میں فطرہ بدی ہے جسکی مرثت دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو (بقیر برصواتنہ)

خدا نے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجالانا ہے اسی لیے قرآن پاک میں عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے۔

ان الذین یستکبرون عن عبادتی
سید خلون جہنم وادخولن (سورہ: ۶۱)
جو میری عبادت سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔
فرشتوں کے متعلق فرمایا:-

ومن عندنا لا یتکبرون عن عبادتہ (انبیاء: ۲)
جو اے پس میں وہ اس کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔
سعادت مند اور باایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا:-

انما یؤمن بآیتنا الذین اذا ذکرناہم
خردا سجدا و سجوا کحمد ربہم وھو
لا یتکبرون (سورہ: ۲۱)
میری آیتوں پر وہی ایمان لانے ہیں جنکو ان آیتوں کے بکھایا جائے تو وہ بجمہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔

اس قسم کی آیاتیں بھی قرآن پاک میں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و استکبار باہم مقابل کے

(بقیہ صفحہ سابقہ) برائی سے بچنے کی شہیرہ بتانی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کرے، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا: ایک تو وہ جو اپنی جان مال کو خدا کی راہ میں قربان کرنا ہے، دوسرا وہ جو کسی گھاٹی میں چلے کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے۔ اس تعلیم نبوی نے انسانوں کی دو قسمیں کر دیں ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور ہمت کی فطری توفیق ملی ہے تو ان پر فرض ہے کہ وہ مجمع اور ہجوم میں نہ کر انکی بھلائی کا فرض انجام دیں، یہاں تک کہ اس راہ میں انکی دولت بھی خرچ ہو جائے اور ان کی جان بھی کام آجائے دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں طبعاً مردم آزاری اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہے، انکی اخلاقی اور روحانی اصلاح اس میں ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں تاکہ وہ گناہ کے بارے اور لوگ ان کے آزار سے محفوظ رہیں۔

دوسرا موقع جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزالت نشینی کی اجازت دی ہے، وہ ہے جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک میں فتنہ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس کے چلے بندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئیگا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی، جس کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو تلاش کرے گا تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو متوسل سے بچا سکے (صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلة راحة من خلاط السوء)

گوشہ گیری اور عزالت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہیں، پہلے موقع میں ایسے فرد کو جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدہ کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا جماعت اور فرد دونوں کے لیے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام اتر ہو گیا ہے اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اسکے لیے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر ہی اپنی ملکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے۔

صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلة راحة من خلاط السوء

متضاد معنی ہیں، اس بنا پر اگر غرور و استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا بکھنا، اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز بھانا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے اپنی گردن اطاعت کو خم کرنا ہے اس بنا پر صحیفہ محمدی کی زبان میں عبادت بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو یا اگر کوئی انسان بظاہر کیسے ہی اچھے سے اچھے کام کرے لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا، اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کیلئے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امر فارق ہے۔ قرآن پاک میں یہ نکتہ جا بجا ادا ہوا ہے۔

وسیعجبنا ان لا تتقی الذی یؤتی مالا
یکفیک و ما لاحد عندک من نعمة تجزی
الا ابتغاء وجه ربہ الاعلی
ولسوف یرضی (سورہ: ۱)
مفتنے سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا جو اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے۔ اس پر کسی کا احسان باقی نہیں جس کا بدلہ اس کو دینا ہو بلکہ صرف خدا نے ہرگز کی ذات اس کا مقصود ہے، وہ خوش ہوگا۔

وما تنفقون الا ابتغاء وجه اللہ (بقرہ)
انما نطعمکم لوجه اللہ (دہر: ۱)
فویل للمسکین الذین ھو عن صلواتہم
سأھون الذین ھو مؤذون (ماعون: ۱)
صرف خدا کی ذات کی طلب کے لیے جو تم خرچ کر رہے ہو۔ ہم تو صرف خدا کے لیے تم کو کھلاتے ہیں۔

قرآن کی ان آیتوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مختصر لیکن بلیغ فقرہوں میں فرمادی ہے کہ:-
انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری و مسلم)

اسی کی تشریح آپ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے۔
لکل امرہ ما نولی فمن کانت ہجرته الی اللہ
ورسولہ فاجرہ علی اللہ ومن کانت ہجرته
الی دنیا یصیبھا و امرأتہ ینکحھا فھجرتہ
الی ما ھاجر الیہ (بخاری باب اول)

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا تو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں پہلی چیزوں کی نیت اور اخلاص ہے، اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اس کے احکام کی اطاعت ہے، عبادت ہے، اگر تم اپنی شہرت کے لیے کسی کو لاکھ روپے دلو، تو وہ عبادت نہیں لیکن خدا کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی بجا آوری کیلئے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔

تعلیم محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کے

غرض و غایت بنا ویلے اور یہی عبادت سے اسلام کا اصلی مقصود ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ
وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ: ۲۱)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصول تقویٰ ہے۔

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تقویٰ کی جگہ یہ ہے اور قرآن نے بھی تقویٰ القلوب (دلوں کا تقویٰ) کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے، اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے، نماز، روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں، اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہیں۔

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں یاد کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند ان مخصوص اعمال کا نام ہے جن کو انسان خدا کے لئے کرتا ہے۔ مثلاً نماز، دعا، قربانی، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیدار و وسیع کر دیا، اس تعلیم کی رو سے ہر ایک وہ نیک کام جو خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے کیا جائے، عبادت ہے، اسلام میں خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لئے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لئے ہو لیکن اس کام کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش، دکھاوا، حصول شہرت یا دوسروں کو افسانہ مند بنانا، وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضامندی ہو۔

اس تشریح کی رو سے وہ عظیم انسان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس کو دفعہً مٹا دیا، دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کے جائیں لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمائش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں، دین کے کام ہیں اس لئے دین اور دنیا کے کاموں میں، کام کا تفرقہ نہیں بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے۔ تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے، فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی نشلی کرو، اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے کہ اس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو، غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا، خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كَلِمَاتٍ مَّا

۱۰ مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحريم ظلم المسلم ۱۱ (زوج رکوع: ۳) ۱۲ صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الضعیف

رَزَقْنَكُمْ وَأَشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ

إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (بقرہ: ۲۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی و صومنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لئے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا :-

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (سود: ۱۰)

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے، فرمایا :-

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ (مریم: ۳)

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین و تشفی کی بات کرنا اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے، ارشاد ہے :-

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ

صَدَقَةٍ يَتَّبِعُهَا أَذَى (بقرہ: ۲۶۰)

اسی آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے،

كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ (بخاری کتاب الادب)

تسماتك في وجه اخيك صدقة

واماطة الاذى عن الطريق صدقة

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ فرمایا :-

الساعي على الارملة والمسكين كالمجاهد

في سبيل الله وكاذبي يصوم النهار

ويقوم الليل (بخاری، کتاب الادب)

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے جس کا درجہ

نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپ نے ایک دن صحابہ سے فرمایا :-

الاخبركم بافضل من درجة الصيام

والصلوة والصدقة

صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ارشاد فرمائیے، فرمایا :-

اصلاح ذات البين

حضرت سلمان فارسی ایک دوسرے صحابی حضرت ابو ذر سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی بیوی نہایت معمولی اور

میلے کپڑے پہنے ہیں۔ حضرت سلمان نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے، اس کے

بعد لہمان کے لئے کھانا آیا تو ابو ذر نے کہا میں رونے سے ہوں۔ حضرت سلمان نے کہا میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤنگا

آخر انہوں نے افطار کیا، رات ہوئی تو ابوذرؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے، حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہا ہوں، پھیل پھر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا اور کہا اب نماز پڑھو۔ چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا "اے ابوذر! تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو۔" حضرت ابوذرؓ نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی، آپ نے فرمایا کہ سلمانؓ نے سچ کہا۔

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! تمام کاموں میں سب سے بہتر کون کام ہے؟ فرمایا "خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا" لوگوں نے پوچھا "کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے؟" ارشاد ہوا کہ "جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو" انہوں نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو، فرمایا "پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کر نیوالے کی مدد کرو یا جس سے کوئی کام بن آتا ہو اس کا کام کر دو" پھر سوال ہوا اگر یہ بھی نہ ہو سکے فرمایا "تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو، یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو تم خود اپنے اوپر کر سکتے ہو۔"

ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے فرمایا خدا اپنے بندوں سے کیسے لگاؤ میں نے تم سے کھانا مانگا تم نے نہ کھلایا وہ عرض کریں گے کہ خدا وندا! تو نے کیسے کھانا مانگا تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے، فرمائے گا "کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تم سے کھانا مانگا، تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے۔" اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا، وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاؤں تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے، وہ فرمایا "تم کو معلوم رہتا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔" اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تو نے میری بیماری نہ کی وہ کہے گا کہ "اے پروردگار! میں کیوں نہ تیری بیماری پر سی کروں، تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" فرمایا "تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرے فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا یا مجھے اس کے پاس پاتا۔" اس مؤثر طریقہ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے توبر توبر دے چاک کر دیئے اور دکھا دیا کہ خدا کی عیادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا طریقے ہیں۔ حضرت سعدؓ جو چاہتے تھے اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دے دیں، آپ نے انہیں بتایا کہ اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کر دو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے اس کا تم کو ثواب ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو اس کا بھی ثواب ہے! ابو مسعود انصاریؓ سے ارشاد فرمایا "مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔" غریب و نادار صحابہ نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ یا رسول اللہ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، ان کے علاوہ وہ مالی عیادت بھی بجالاتے ہیں جو ہم نہیں بجالا سکتے۔

۱۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام والتکلف للذیف، ص ۹۶ و ۹۷ ادب المفرد امام بخاری باب معونة الرجل اخاه۔
۲۔ ایضاً باب عیادت المرءی۔ ادب المفرد باب یوجری کل شیء صحیح بخاری کتاب النفقات

فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور بحمد اللہ کتنا بھی صدقہ ہے، یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لیے یہ کرتا ہے، فرمایا کہ "اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا؟"

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات سے اندازہ ہو گا کہ حسن عمل، ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی توبر تو برتو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحی محمدیؐ نے بالکل صحیح طور سے خلقت، انسانی کی غرض و غایت، عبادت و الہی قرار دی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

(ذاریات: ۲۰)

اس آیت پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اور اسکی خوشنودی کی طلب ہو۔ اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں جن کے بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے اس کی خلقت ہوئی ہے۔ یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے، درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے سینکڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات کے بے پایاں دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، جن میں سے ہر ایک فریضہ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے جس طرح کسی وسیع معنوں کو کسی ایک مختصر لفظ یا فقرہ میں ادا کر کے اس وسیع معنوں کے سب پر لکھ دیتے ہیں اسی طرح یہ چاروں فرائض و حقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان چار فرضوں کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے۔

۲۔ وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لیے کرتا ہے صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔

۳۔ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جہاد اور جانی قربانی کرنا کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے تکلیف اور مشقت جھیلنا اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کی نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا، جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں طاعی

۱۔ ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقہ

ہوتی ہیں روزہ ہے، یا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

۴۔ دینا نے اسلام میں ملتِ ابراہیمی کی برادری اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتہ اتحاد کا قیام اور اس مرکز کی آبادی اور کسبِ روزی کے لیے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرعنوان حیح ہے۔

غور کر کے دیکھو، انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہیں اصول چہارگانہ کے تحت میں داخل ہیں اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے، توحید و رسالت کا اقرار کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا اور حج کرنا۔" پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے اور بقیہ چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں، انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم شان عمارت قائم ہے۔

اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرض عبادتیں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیات، باب اور محتویات کے ساتھ فرض ہیں جو شخص صرف ان چاروں فرض کو جو عنوانِ باب میں ادا کرتا ہے اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلو تہی کرتا ہے اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت نامکمل ہے اور اس کے لیے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی، جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، مشکوک ہے، یہیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخنتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف کیوں نہیں کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا اور قرونِ اول کی طرح ہماری نمازیں ملکوں کو فتح اور ہماری زکوٰتیں ہمارے قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے :-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

لَسْتُخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (نور: ۷)

ایمان کامل اور اعمال نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

اسی طرح ان چاروں جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے صرف مندرجہ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دینا نے فانی کی بادشاہی کا اہل بنا دے مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اور اسلام اس لیے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھ دے اور یہی اسی وقت ممکن ہے جب عبادت کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔

۱۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان ص ۱۰۲ سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج ۱، ص ۲۵۲۔ مطبع مہدی مصر

کلمة واحدة يعطونها لملكون بها العرب وقد بين بها البحر :-

نماز

أَقِيمُوا الصَّلَاةَ

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر و مغرب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار و تندرست، سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی، اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرے اور اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو، اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرے۔ اگر رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو۔ اگر سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اسی رخ پڑھو۔

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار اس شان و حریم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکر یہ، حسن ازل کی حمد و ثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار یہ اپنے محبوب سے مجبور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرضِ نیاز ہے۔ یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے۔ یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے یہ فطرت کی آواز ہے یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے یہ زندگی کا حاصل اور بہتی کا خلاصہ ہے۔

کسی غیر مرنی طاقت کے آگے سرنگوں ہونا اس کے حضور میں دعا و فریاد کرنا اور اس سے مشکوں میں تسلی پانا، انسان کی فطرت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی ساز ہے جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے جتنا رہتا ہے، یہی اَللّٰهُمَّ بِرُحْمَتِكَ فطری جواب ہے۔ قرآن نے جا بجا انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں، جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو۔

فرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے جس کے سامنے وہ جھکے، اندرون دل کی عرضِ نیاز کرے اور اپنی دلی تمناؤں کو اس کے سامنے پیش کرے، فرض عبادت، روح کے اس فطری مطالبہ کا جواب ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش جنوں کا علاج ممکن نہیں، وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس فطری کی تسلی کے لیے موجود ہیں، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہیں۔

لہ نیل الاوطار، ج ۲، ص ۲۸ بروایت موقوف از دارقطنی ص ۱۰۲ ابوداؤد باب صلوة الطالب ص ۱۰۲ کتاب الصلوة باب

جواز صلوة النافلة علی الدابة فی السفر حیث توجت :-

یہود و نصاریٰ دونوں نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل و صورت بھی انہوں نے بگاڑ دی تھی۔ قرآن مجید میں ان کی یہ صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ
عَرَضَ هَذَا الْأَذَى وَيَقُولُونَ سَلْغُوا لَنَا فِي رِثَةِ
يَأْتِيهِمْ عَرَضٌ مِثْلَهُ يَأْخُذُوهُ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ
بِمِيثَاقِ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ
إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ وَالذَّلَالُ الْآخِرَةُ
خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ
وَالَّذِينَ يُسْتَكُونُونَ بِالْكُتُبِ وَآقَامُوا
الصَّلَاةَ وَإِنَّا لَنُضِيقُ أَجْرَ الْمُضِلِّينَ
(اعراف: ۷۱)

سورہ مریم میں تمام انبیائے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے:-

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ
وَاتَّبَعُوا الشَّلْوَاتِ (مریم: ۳۰)

نماز کے ضائع اور برباد کرنے سے مقصود نماز کو صرف چھوڑ دینا نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اسکی حقیقت اور اسکی روح کو گم کر دینا ہے، مسلمان جب اپنی نماز کے لیے حتی علی الصلوٰۃ (نماز کے لیے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے ہیں تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ ان کی خدا پرستی کی روح اتنی مُردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اس کو ہنسی اور کھیل بنا لیتے ہیں۔

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هَازِلًا
وَلَعِبًا ذَلِكَ بَأْسُهُمْ فَوْمًا لَا يَعْقِلُونَ (مائدہ: ۵۰)

اہل عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے، وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے، بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد، یہ ان کی عبادت کا خلاصہ تھا، حج و طواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے تو ان میں بھی بتوں کا نام لے لیتے، اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے، موجدانہ خضوع و خشوع کا ان کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا، مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کا منہ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے، ڈھکیل دیتے تھے، شور مچاتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا:-

وَمَا كَانَ صَلَاةُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا
مُكَافَاةً تَصَدِيحًا (الانفال: ۳۰)

اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجا،

انکے مفسروں نے اس آیت پاک کے دو مطلب لیے ہیں، ایک یہ کہ واقعاً وہ جو نماز پڑھتے تھے اس میں سب سے اور تالی بجا کرتے تھے، دوسرے یہ کہ جب مسلمان نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنا چاہتے تھے اور گویا یہی ان کی نماز تھی۔ پہلے معنی کی بنا پر تو ان کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کو داور لعل و لعب تھا اور دوسرے معنی کی رو سے سر سے ان کے ہاں نماز ہی نہ تھی بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی۔

ایک اور آیت میں ہے:-

أَرْبَعِينَ يَنْهَى عَنِ الصَّلَاةِ إِذَا صَلَّى
(علق: ۱)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، آپ جب صحن حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے کبھی آپ کی منی اڑاتے اور کبھی دق کرتے، کبھی آپ کی گردن میں پھنڈا ڈال دیتے، اور کبھی جب آپ بچہ میں جاتے تو پشت مبارک پر بجاست لاکر ڈال دیتے تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بار بجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے آغاز میں تو اخفاء کے خیال سے اور اس کے بعد ان کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غاریادہ میں چھپ کر نماز پڑھتا کرتے تھے اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے یا پھر راستہ کے سائے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے، مشرکین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے، ابن اسحاق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے، ایک دفعہ حضرت سعد بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آ گئی، اس نے اس نماز کو بدعت دنیا کام سمجھا اور مسلمانوں کو بڑبھلا کہا اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہو گئی۔

الغرض جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو خدا کے آگے سزبجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے۔ ان کی نمازیں بالعموم اخلاص و اثر، سکون و دل جمعی، خشوع و خضوع اور خوف و خشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کو بھی اپنے بچہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی، ان کے ہاں شرک کا منظر بن گئی تھی، تیسرے وہ یعنی عرب بت پرست، جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا اور نہ کبھی خدا کے آگے سزبجود کیا وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے۔

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا یا تھا اللَّهُ تَرَوْكُمْ قَدْ نَزَّلْنَا ذِكْرًا فَكَيْتَرُونَ (۱) اسے لحاف میں لپیٹے ہوئے اٹھ اور ہوشیار کرا اور اپنے رب کی بڑائی بول۔ رب کی بڑائی بولنا، یہی نماز کی بنیاد ہے اس کے بعد رفتہ رفتہ نماز تکمیل

لہ ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ ایضاً صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابوبکر رضی اللہ عنہ صحیح بخاری کتاب العلق باب المرأة
نظر عن المصلی شیئا من الاذی سے سیرۃ ابن ہشام (ابتداء ما فرض اللہ سبحانہ من الصلوٰۃ)

کے طرز پر کرتی ہوئی اس لفظ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔ آپ نے سونے والوں کو جگایا بھولے ہوؤں کو بتایا، انجانوں کو سکھایا اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑا، گوشت پوشت کے ہونے چاندی کے اور اینٹ اور پتھر کے ان تہوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے، دھکیل کر نیچے گرا دیا، صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی۔ اور خدا کے سوا ہر ایک کے بچہ کو حرام قرار کر دیا، اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعے نماز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی، آپ نے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست قوموں کو نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، مؤثر دعائیں تعلیم کیں، عیسائیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا حکم دیا یہودیوں کو نماز کے خصوصاً و ششوراً، راز و نیاز اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا اور انبیاء نے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعے سے شکل و صورت اور روح و حقیقت دونوں کیساتھ ناقابل تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا، حکم ہوتا ہے کہ:-

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ (بقرہ: ۳۱) نمازوں کی نگہداشت کرو۔

یہ نماز کی ظاہری اور محسوس دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ:-

وَهُمْ عَلَى صَلَواتِهِمْ يُحَافِظُونَ (انعام: ۱۱) اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔

الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَواتِهِمْ يُحَافِظُونَ (معاذ: ۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَواتِهِمْ يُحَافِظُونَ (مومن: ۱) اور کامیاب ہیں، وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل و عیال کو بھی اس کا حکم دو اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کیساتھ جے رہو، فرمایا:

وَأَمْرٌ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ادا اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اہمیت پر توجہ دینا۔

(ظہ: ۸۱)

نماز کیسی ہونی چاہیے؟ فرمایا:-

فَقُوْا سُبْحَانَ اللَّهِ قَائِمِينَ (بقرہ: ۲۱۰) اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔

تصریف کی گئی کہ:-

الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَواتِهِمْ خَاشِعُونَ (مومن: ۱) کامیاب ہیں وہ مومن، جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔

حکم ہوا کہ:-

أَدْعُوا رَبَّكُمْ ذُخْفَةً وَخُفْيَةً (اعراف: ۷۰) تم اپنے پروردگار کو گڑ گڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔

وَأَدْعُوا خَوْفًا وَطَمَعًا (اعراف: ۷۰) اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کیساتھ پکارو۔

وَأَدْعُوا مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ اور خدا کو پکارو، اس حال میں کہ تم دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والے ہو۔

(اعراف: ۳۱)

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ | اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی

گئی ہو لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے اس لیے ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی رہی چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں، آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کو واضح، معین اور تاکید کی حیثیت حاصل نہیں، یعنی کسی مذہب کے پیروؤں بلکہ مفسرین کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی۔ وہ نہ جیسا کہ گذر چکا قرآن کے رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس کو خدا کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں واضح، اور موکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے اس لیے اس فریضہ الہی کو دین کامل میں ایسی منظم، واضح، موکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سکڑوش نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اس کی تاکید آتی ہے، اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت اور اس کا ترک کفر کی نشانی بتائی گئی ہے۔ یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شہستانِ قدس میں ہوئی جسکو معراج کے معنی

اسلام میں پہلا فرضی ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے، چنانچہ سورہ

روم (رکوع: ۴۴) میں پہلا حکم دیا گیا کہ فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتِ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ

اِنَّهَا دَايِمًا مِنْهُ بِرْطَفٍ مِنْهُ لِيُخْرِجَكَ مِنْهَا رَاكِبًا فَاسْتَقِمْ وَاللَّهَ مَعَكَ وَلَا تُصَلِّ لِرِضَاكَ وَلَا تَسَلِّ عَلَى النَّاسِ اِنَّكَ تُكْفَرُ عَنْهُمْ وَإِنَّمَا تَصَلَّى عَلَىٰ نَفْسِكَ (بقرہ: ۱۷۷) اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملتی ہے:-

وَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتِ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ (بقرہ: ۱۷۷) اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس آیت پاک سے ایک تو توحیدِ حاکمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری

بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ جب تک

دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعے سے بڑھاتے نہ ہیں خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف

لگا رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور

اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ذکر ظاہر فرماتے رہے۔

چنانچہ آپ نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے، ایسے

نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آ کر

لے منافقین کی صفت میں ہے: فَاذْا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَى (نساء: ۷۱) جب وہ نماز کاٹھتے ہیں تو سست کھل کر کھٹتے ہیں؛

فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَواتِهِمْ سَاهُونَ (معاذ: ۱) افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔

لے کفار کے بارے میں ہے: لَسَوْفَ نَكْفُرُكَ مِنَ الْمُصَلِّينَ (مدثر: ۲) ہم نمازیوں میں نہ تھے یہ وہ اس وقت کیسے گے جب ان کو پوچھا

جانے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو؟ تہ کتب صحاح ما قبلہ معراج و اسراء و صبح بخاری کتاب الصلوة ۶

صلح کی بات چیت شروع کی، تو نماز، جہاد اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا، آپ نے دو پھلی باتوں سے مستثنیٰ کر دیا لیکن نماز کے متعلق فرمایا جس دین میں خدا کے سامنے نہ ہو۔ اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ نماز دل کی روشنی ہے۔ اپنی نسبت فرمایا ہے نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ ایک تمثیل میں آپ نے فرمایا انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے۔ یہ محبوبِ انزل کے ہجر و فراق کی آگ ہے اور نماز آپ زلال ہے جو اس آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ نے فرمایا کہ کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی ہے کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اظہار اسکے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے۔ مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے، نماز ہی ہے۔ عین اس وقت جب جناب رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ فرما رہے تھے نماز اور غلام!

نماز کی حقیقت نماز کے لیے اصل عربی لفظ صلوٰۃ ہے، صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانوں میں دعا کے ہیں، ایسے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے، معاویہ بن حکم سلمیٰ ایک نو مسلم صحابی تھے انکو اسلام کے جو آداب بتانے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں تم یہ کہو، اتفاق سے ایک دفعہ نماز باجماعت ہو رہی تھی، معاویہ بھی اس میں شریک تھے، انکے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی ماضیوں نے نماز کی حالت میں یرحمک اللہ کہہ دیا، صحابہ نے انکو گھورنا شروع کیا، معاویہ نے نماز ہی میں کہا تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہ نے راتوں پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ نماز ہو چکی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ نماز میں کون باتیں کرتا تھا؟ لوگوں نے معاویہ کی طرف اشارہ کیا، آپ نے انکو پاس بلا کر نہایت نرمی سے کھجایا کہ نماز، قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اسکی پاکی اور بڑائی بیان کرنا کیا نام ہے اس میں انسان کو باتیں کرنا مناسب نہیں۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ اللہ عا، معراجاً دعا بادت کا مغز ہے۔ اور حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ عا، هو العبادۃ دعا ہی عبادت ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ کہہ کر کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی جس میں دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے۔

أَدْعُوْنِي - اسْتَجِبْ لِكُلِّ مَن دَعَانِي الَّذِيْنَ يَسْتَجِبُوْنَ
عَنْ عِبَادَتِيْ يَسْتَجِبُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرُوْنَ (مؤمن: ۱)
مترجمی کرتے ہیں وہ مغرب جہنم میں جائیں گے۔
مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) میں ہے کہ آپ نے فرمایا: بہترین عبادت دعا ہے۔ اس کے بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی۔ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کی گئی ہے، یعنی خدا کی یاد، فرمایا :-

یہ تمام حدیثیں کنز العمال کتاب الصلوٰۃ جلد ۳ میں مختلف کتب حدیث کے حوالہ سے درج ہیں۔ سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب تہیت العاطس فی الصلوٰۃ یہ درود اتیس ہیں ہم نے ان دونوں کو جمع کر لیا ہے یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی کتاب الدعوات میں ہیں، دوسری حدیث ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب الدعاء میں اور مستدرک حاکم کتاب الدعاء میں بھی ہے :-

اقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (ظہ: ۱) اور میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔
کامیابی اسی کے لیے ہے جو خدا کو یاد کر کے نماز ادا کرتا ہے۔
تَذٰ اَفْلَحَ مَن تَذٰكُرْتَنِيْ وَذَكَرْتُكَ رَّبِّهٖ فَصَلِّ (اعلیٰ: ۱)
کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا پس نماز پڑھی۔
انسان کو اپنی روحانی تربیت، دلی بے چینی، قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر دامادہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون وطمینان کی راحت اس کو صرف اسی ایک قادر مطلق کی پیکار، دعا اور التجا میں ملتی ہے۔ وحی الہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

اَلَّذِيْذَكَرُوا اللّٰهَ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد: ۲۸)
ہاں! خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ مصیبت کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثبات قدم اور دعا ہی چارہ کار بنتے ہیں۔
وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ: ۵)
ثابت قدمی اور نماز (یاد خدا) کے ذریعہ اپنی مصیبتوں میں چھاپو۔
زمین سے لیکر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدا نے قادر و توانا کے سامنے سرنگوں ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، بھاڑ، چرند، پرند سب اس کے آگے سربسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی بے چون و چرا، اطاعت کر رہے ہیں، یہی ان کی تسبیح و نماز ہے۔
اور (دینا میں) کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کے کی تسبیح پڑھتی ہے البتہ تم انکی تسبیح کہتے نہیں ہو۔
کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں اور جو زمین میں اور جو چاند، ستارے، پہاڑ، درخت جاندار ہست آئی اسکو بکہہ کہتے ہیں اور بہت سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا کیونکہ وہ اس کو بکہہ نہیں کرتے تھے

وَاَنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يَسْبُحُ بِحَمْدِهِ وَاَلَكُنْ اَدَّ تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل: ۵)
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَمَن فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالْحَيٰوةُ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَ كَثِيْرٌ مِّنْ عِنْدِ الْعِزٰبِ (روم: ۲۰)
غور کرو کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثناء خدا کے سامنے سرنگوں ہے لیکن استثناء ہے تو حضرت انسان میں کہ بہتیرے اسکو سجدہ کرتے ہیں اور بہتیرے اس سے روگرداں ہیں اسی لیے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثناء اطاعت گزار ہے کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ انزل سے اپنے کام میں مصروف ہے اور قیامت تک مصروف رہے گی لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکش اور بناوٹ پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انھیں سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع و فرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت و انقیاد اور بندگی و سرفرازی کی دعوت دیتی ہے جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے تو انسان کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے، اور یہی نماز ہے۔
نماز کی روحانی غرض و غایت | نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالقِ کل، رازقِ عالم،

ملک الملک، منعم اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کرتے ہیں کہ
 نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی اور بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے، اس
 کی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ناقابل زوال یقین کی صورت میں
 اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر ذلی ارادہ و نیت اور جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار
 آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں، جس سے اپنے بڑے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے
 جھکیں اور بالآخر ان سے بالکل باز آئیں، صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں ان کی حقیقت دریافت کی، آپ نے اس کی
 تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ! احسان کیلئے؟ فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گے کہ تم اس کو
 دیکھ رہے ہو، کیونکہ تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے، اسی طرح ایک شخص کو نماز کے احباب کی
 تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوڑے کیونکہ اس وقت وہ اپنے رب کیساتھ راز و نیاز کی باتوں
 میں معروف ہوتا ہے، حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ اشکاف میں بیٹھے تھے اور شاہد لوگ الگ
 الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپ نے سہ ماہک باہر نکال کر فرمایا لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے
 رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس کو جاننا چاہیے کہ وہ کیا معنی معروض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت
 دہاؤ، ان تعلیمات سے اندازہ ہو گا کہ نماز کی عبادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات
 طاری ہو سکتے ہیں اور اسکے اخلاق و عادات پر کتنا گراثر پڑ سکتا ہے، اسی لئے قرآن پاک میں اس نکتہ کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

اقِمِ الصَّلَاةَ اِنَّ الصَّلَاةَ كُنْهِيَ عَنِ الْفَحْشَاءِ
 وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ اَكْبَرُ (مکرت: ۵) روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سے بڑی چیز ہے۔

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے
 اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بے حیائی اور برائی
 کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے، یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے، جس کا حصول انسان کی
 منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلَّى (علی)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا
 نام لے یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے۔

اِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِيْنَ يُحْشِنُوْنَ رَبَّهُمْ
 بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاَوْسَوْا

تو انہیں کو تو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے
 پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں

تَزَكَّى، فَاِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِيْنَ لِنَفْسِهِمْ وَاَوْسَوْا
 اللَّهُ الْمُصِيْرُ۔

(فاطر: ۲۰)
 اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور
 اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ فرمایا۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوًّا عَلٰٓا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ
 جَزُوًّا عَلٰٓا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوًّا عَلٰٓا
 الْمُصَلِّيْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰٓا
 صَلَاتِهِمْ ذُرِّيَّتُهُمْ (معارف: ۱)

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سانی ہے۔
 نماز کے انھی ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تخیل میں صحابہ سے
 فرمایا کہ اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف و شفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پینچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا
 اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ صحابہ نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ! ارشاد ہوا کہ نماز بھی اسی طرح گناہوں
 کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو، ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آکر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر
 چاہی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَقِيْمِ الصَّلَاةَ طَرَفِ النَّهَارِ وَزُلْمًا
 مِنْ اٰتِلِ اِنَّ الْحُسْنَیٰ يَنْهٰ عَنْ الشَّيْءِ
 ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (ہود: ۱)

اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ گھنٹوں
 میں نماز کھڑی کیا کرو، بیشک نیکیاں برائیوں کو دور
 کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کو۔
 اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا
 ہے، انکا اصلی ہر قسم سے نماز ہے جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجالاتی گئی ہو، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جسے گرجانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔
 نماز کے لیے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت | جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جن کی پابندی اور
 رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب
 'قلب کا عالم' اور فلسفہ نفسیات یا 'دماغی کیفیات' کہتا ہے اس کے لیے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جن
 کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور
 ان کے صحیح نتیجے مترتب ہوتے ہیں، سائنس (طبیعیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گمراہ کو بالکل

اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے، وہ
 اپنے ہی لیے حاصل کرتا ہے، اور (آخر) خدا ہی
 کے پاس لوٹ کر جاتا ہے۔

بیشک انسان پھلنا ہے، جب اس پر مصیبت
 آنے تو گھرا اور جب کوئی دولت ملے تو بھلے، لیکن
 وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز بیخبر
 ادا کرتے ہیں۔

یہ سائنس (طبیعیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گمراہ کو بالکل
 لہ یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے، کنز العمال ج ۲ ص ۶۸۰، ۶۸۱ میں حاکم، احمد ابن
 حنبلہ، طبرانی اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں، صحیح بخاری کتب مواقیح الصلوٰۃ (تفسیر سورہ ہود)

۱۲۹۰۶۷

کھول دیا ہے اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے اندر جس قسم کے جذبات اور دلوں سے پیدا کرنا چاہیں اور ان کے مناسب شکل و صورت اور ماحول (گرد و پیش) بنا اختیار کریں، تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی، ہم سے تمام تمدنی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوتے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے رواجی رسوم و آداب اور قواعد و ضوابط مقرر ہیں۔ معبودوں، بیگوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، بجاریوں اور کابھوں کے خاص لباس، خاص رسوم و آداب، سکون و خاموشی، ادب و لحاظ، گھنٹوں کی پرشکوہ آواز اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں، شاہان و رعب و داب کے اترات پیدا کرنے کے لیے شاہی جلو سوں اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پرے قوی سیکل چوہدر عصار بردار نقیب و چاؤش، خدام کی زرق برق پوشائیں، ہنگلی تلواریں، بلند نیزے، تخت دتاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت و نقارہ اور دمدم دور باش اور نگاہ رو برو کی پر رعب صدائیں ضروری ہیں، کسی تعسبی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لیے فضا کا سکون و خاموشی، مقام کی سادگی و صفائی، شور و غوغا اور شہر و بازار سے دوری ضروری چیزیں ہیں، بزمِ عروسی کے لیے رنگ و بو، نور و سرور، گانا بجانا اور عیش و نشاط کا اظہار طبعی ہے۔

اخنی صبی و نفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات و آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے، نماز سے مقصود دل کے خضوع و خشوع، توبہ و انابت، پشیمانی و شرمندگی، اطاعت و بندگی اور خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و رمانگی کا اظہار، نیز دل و دماغ اور نفس و روح میں پاکی، صفائی و طہارت پیدا کرنا ہے، اس بنا پر نماز کے لیے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کیے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشوونما ہو، مثلاً نماز پڑھنے والا رکوع کر کے وہ اب شہنشاہِ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، اچھے باندھے رہے، نظر نیچے کیے رہے، طور و طریق اور حرکات و سکنات میں ادب و احترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب اسکی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے! اس ظاہری مجبومی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیات پر پڑتا ہے اور اسکی روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے، تو دل کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اسکے اندر مؤثر انداز میں کیوں کر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری و ساری ہے، اندر بنانے کے لیے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز، اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دو بانا کر دے گا! اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وسعت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت سکولوں کی تنظیم اور انکی درجہ بندی، کھیل میں فریقین کی بمرنگی و ہم لباسی، فوجوں میں وردی اور حرکت و عمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور بمقدم سکون و رفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندر فوجی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکلیف ہوں، ان کی حقیقی کیفیت اپنے اثر سے

دوسروں کو بھی نہر کیفیت بناتی ہے اور ان سے دوسرا، اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم و بیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے اسی لیے جلسوں میں ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آجاتا ہے، نفسیات اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لیے ان طبعی و نفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے، نماز کے آداب، شرائط اور ارکان اخنی کا نام ہے۔

ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے | یہ بار بار دہرایا جاتا ہے کہ نماز کے مقصود خضوع و خشوع، ذکر الہی، حمد و ثنا اپنے گناہوں پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے۔ یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں، جن کے لیے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے اسی لیے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں، ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید و شرط کے بغیر ادا کر سکے، اس کا نام عام تسبیح و تہلیل اور ذکر الہی ہے، جس کے لیے نماز کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحاظ اور ہر صورت میں انجام پاسکتی ہے چنانچہ خدا نے فرمایا :-

فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ (سنا: ۱۵) بس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔

اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے صحابہ کرام کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا
وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ (آل عمران: ۳۰) ہیں۔ جو کھڑے بیٹھے، اور لیٹے خدا کو یاد کرتے

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے۔ فرمایا :-

رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ
عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (نور: ۵) ایسے لوگ ہیں جنکو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے | دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل و صورت کے ساتھ خاص اوقات

میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ سے ادا کیجائے اسکا نام نماز ہے، پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے اور وہ ہر فرد کے جدا گانہ انتخاب پر منحصر ہے اسکو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا منسوخ بتایا گیا ہے، وہ تنہائی کا راز ہے جسکو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہیے کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اسی لیے اسکو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اسکے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے۔ اگر اسکو جماعت کے ساتھ ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہے گی، دوسرے لفظوں میں ہم ان کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر و فکر اور تسبیح و تہلیل، انفرادی طریقہ عبادت ہے اور نماز ایک جماعتی شعار ہے جو خاص ارکان اور شرائط کیساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے اور جس کے ادا کرنا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں حکم ہے، البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اسکو ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال اس سپاہی کی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے، جس کے ساتھ اس کو چلنا تھا، کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا، اب تنہا رہ کر بھی اس کو

وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا۔

نماز میں نظام وحدت کا اصول | اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت طرز کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے، وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصل راز بلکہ سرکار ہے، اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے، یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ مکتہ پروری ہے بلکہ وہ ملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہیے، اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا منظر ہے، نماز کی ایک حرکت، ایک جنبش، ایک لفظ، ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراش کر نا چاہیے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت آئین و طریق، اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا، جماعتیں اس کو ایک متحدہ نظام میں ادا نہیں کر سکتی تھیں، نماز لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جنھوں نے دعوت محمدی کو قبول کیا، فرض تھی، اب اگر انہیں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے، جب چاہے، جدھر چاہے منہ کر کے ادا کر لے تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤں سے بھی توحید کا راز آشکارا ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں، کروڑوں مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے۔

غرض اس نظام وحدت کا آشکارا ہو پیدا کرنا، توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار تھا۔ اور کروڑوں دلوں کو جو کروڑوں اشباح و اجسام میں ہیں ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت واحد صورت و شکل میں، واحد اعمال و افعال کا صدور کر لیا جائے، چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظامات کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و اجتماع کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے۔

نماز میں جسمانی حرکات | یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے، کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف میں زرد پڑ جاتا ہے، خوشی میں کھل اٹھتا ہے، غم میں سکڑ جاتا ہے۔ جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے کسی کی تعظیم کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے آگے جھکتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل، فرد تنی اور خوشامد مقصود ہو تو منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں، اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح نماز کی دعائیں انسانی طرز بیان میں ادا کی گئی ہیں، اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں۔

انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اس کے جسمانی اعضاء ہیں، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے

ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہیں کر سکتا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سر سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے، اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی، اور اس لیے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ظاہری و باطنی دونوں حیثیتوں سے عرض و التجا، اور تذلل و عاجزی کی تہذیب بن جائیں۔ انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے اس کی زندگی کے دونوں جزو خدا کے احساسات و انعامات سے یکساں گراں بابر ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونوں جھک کر سجدہ کیا جاوے اور اس کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی حمایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کیے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب میں نماز کا پیکر بنایا گیا ہے، جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں، کھڑے ہو جاتے ہیں، جھک جاتے ہیں، زمین پر سر رکھ دیتے ہیں، نماز کے بھی یہی تین رکن ہیں، چنانچہ آغاز عالم سے انبیائے کرام نے جس نماز کی تعلیم انسانوں کو دی وہ انہیں تین اجزاء سے مرکب تھی، کھڑے ہو جانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھ دینا (سجدہ)۔

ارکان نماز | معلوم ہو چکا ہے کہ نماز، ملت ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، حضرت ابراہیم کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تظہیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی۔

وَطَهَّرْنَا بَيْتَنَا لِلنَّاسِ يُغْنِيَنَّ وَالْقَائِمِينَ
وَالرَّكْعَ السَّجُودَ (ج: ۴)

اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، کھڑے ہونے والوں کو
کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک و صاف کر۔

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے، حضرت مریم کا زمانہ سلسلہ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، ان کو خطاب ہوا۔

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي
وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ (آل عمران: ۵)

اے مریم! اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہو کر بندگی کر
اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔

اس نماز مریم کی میں بھی، نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں۔

ان ارکان کی ترتیب | جب کوئی حقیقت تین مرتبہ ارکان سے مرکب ہو اور ان میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرے کا سب سے مؤخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام اور رکوع اور سجود سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائیگا۔

فَاذْكَرْتُمْ فِيهِمْ فَاتَّبَعْتُمْ لَهُمُ الصَّلَاةَ
فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكُمْ وَلْيَأْخُذُوا
أَسْلِحَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَانصَبُوا
رُءُوسَهُمْ لِرَبِّهِمْ (نساء: ۱۵)

جب تو ان میں سے تو ان کے لیے نماز کھڑی کرنے تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار لیے رہیں، پھر جب یہ سجدہ کریں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا ہے اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوتی ہے پس لا محالہ رکوع، قیام و سجود کے بیچ میں ہوگا اور ہر رکعت کے ارکان سرگاندہ کی ترتیب یہ ہوگی کہ اول قیام پھر رکوع، پھر سجود۔

تورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مترجموں نے عبرانی اور یونانی لفظوں کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کر دیے ہیں جن سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑ جاتا ہے، بہر حال عبادت اور تعظیم کے یہ تینوں طریقے حضرت ابراہیم کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے، ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قیام | ابراہیم (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا " (پیدائش ۱۸-۲۲)

رکوع | اور ابراہیم، زمین تک ان کے آنکے جھکا اور بولالے خداوند " (پیدائش ۱۸-۲۰)

سجدہ | اور یہ سن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی اور ان کے دکھوں پر نظر کی، انہوں نے اپنے سر جھکاٹے، اور سجدے کیے " (خروج ۳-۲۱)

تب ابراہیم (ابراہیم) منہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہمکلام ہو کر بولا " (پیدائش ۱۷: ۳)

تب ابراہیم (ابراہیم) نے اپنے جوانوں سے کہا تم یہاں گدھے کے پاس رہو میں اس لڑکے کے ساتھ اپنے فرزند کی قربانی کے لیے، وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس آؤں گا " (پیدائش ۲۲-۵)

تب اس مرد (حضرت اسحاق کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابراہیم کا خدا ہمارا ہے " (پیدائش ۲۳: ۲۶)

" اور ایسا ہوا کہ جب داؤد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا، جہاں اس نے سجدہ کیا " (۲ موال ۱۵-۳۲)

زبور میں حضرت داؤد خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں :-

" اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس سیکل کی طرف تجھے سجدہ کریں گا " (زبور ۵: ۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیم ہی ملت میں عبادت اور تعظیم الہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے، موجودہ انجیل میں دعا و نماز کا ذکر متی ۶: ۵، ۱۷، ۲۱، ۲۶، ۲۹، مرقس ۱۳-۲۲، لوقا ۲۲-۳۱ وغیرہ میں ہے، طریقہ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لیے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲-۳۱) اور دوسری میں (متی ۲۶-۲۹) منہ کے بل گرنے یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور لوقا انجیلوں میں خاموشی ہے۔

عید بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہو کر تورات یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے اور سجدہ بھی کرتے تھے، قرآن پاک کی شہادت ہے :-

لَيَسُوْا سِوَاۤءًا مِّنْ اٰهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ
قٰمَةٌ يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اَخَاۤءَ
الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ (آل عمران: ۱۱۳)

وہ برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔ روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کھڑے کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔

اسلام کی نماز بھی انہیں قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیم کے عہد سے اب تک چلی آرہی ہے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے "

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقف عام کر دیا۔ انسانی آمیزشوں کو نکال کر بھلانے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا۔ مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان یکسر میں حقیقت کی روح پھونک دی، اس میں اخلاص کا جو ہر پیدا کیا اس کو دین کا ستون بنایا اور اپنی متواتر تعلیم و عمل سے اس کی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا اس طرح اس نے اس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لیے وہ نازل سے منتخب تھا۔

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق بیسج و تہلیل اور ذکر الہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے، خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے تو نماز کو اس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے۔

حَافِظُوْا عَلٰی الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوٰةِ الْوُسْطٰی وَ
تَمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ۗ فَاِنْ خِفْتُمْ فِرْجَآلًا
اَوْ رُكْبَانًا فَادْآءُ اٰمِنْتُمْ فَاذْكُرُوْا لِلّٰهِ كَسًا
عَلَّكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ ۳۱)

نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر۔ (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو آنگٹھ

ویسے یاد کرو جیسے اسے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکر الہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اسی کی تفصیل سورہ نساء میں ہے اسی طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق کہا گیا ہے :-

فَاذْأَقْضِيْتُمْ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَيْفَا مَّا
وَتَعُوْذُوْا عَلٰی جُنُوْبِكُمْ فَاذْأَطْمَأْنِنُوْا
فَاَقِيْمُوا الصَّلَاةَ (نساء: ۱۵۱)

پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکے تو اللہ کو اٹھتے،
بیٹھے اور پہلوؤں پر یاد کرو۔ پھر جب اطمینان ہو
جائے تو نماز کھڑی کرو۔

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں، اول یہ کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصلوٰۃ (نماز)
کہا گیا۔ اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، لیٹے اور لڑائی، حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری
ہوئی اس کو صرف ذکر اللہ کہا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی محض نماز کو اقامتِ صلوٰۃ
(نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہیں کیا گیا حالانکہ ذکر الہی، تسبیح و تہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں موجود تھے بلکہ
یہ فرمایا گیا کہ پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے
معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثناء اور تلاوتِ قرآن سے جدا گانہ ہیں یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر و فکر،
تسبیح و تہلیل، حمد و ثناء اور قراءت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو
گئے تھے۔ اور اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے
یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورہ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اُس طرح یاد کرو جس
طرح اس نے بتایا ہے:

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے گو اس کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی اور صحابہ کو کس طرح کی نماز سکھائی، کیونکہ نماز کی یہ عملی
کیفیت پورے تواتر کیساتھ اس عہد سے لیکر آج تک موجود ہے اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم
ہے اور اسلام کے ہر فرقہ میں یکساں طور سے عملاً بلا اختلاف مسلم ہے تاہم نظر یہ پسند لوگوں کے لیے قرآن پاک سے
ان کا ثبوت پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں مؤدب کھڑے ہوتے ہیں۔

حَافِظُوْا عَلٰی الصَّلٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوَسْطٰی قَدْ
فُوْضُوْا اِلَيْهِ قَانِتِيْنَ (بقرہ: ۲۳۱)

نمازوں پر (مومن) اور بیچ کی نماز میں (خصوصاً)
نگاہ رکھو، اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو۔

وَذْكُرُوْا سُوْرَةَ بٰسْمِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (اعلیٰ: ۱)

اور اپنے پروردگار کا نام لیا، پس نماز پڑھی۔
اور اپنے رب کی بڑائی کرو۔

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے اسی حکم کی تعمیل ہے۔

اس کے بعد خدا کی حمد و ثناء کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ لَ (طور: ۲)

اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو۔
پھر قرآن پڑھتے ہیں۔

فَاَقْرَأْ ذٰلِكَ مَا تَلٰسُرُوْنَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (مزل: ۲۰)

قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسما، اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ
بیان کرتے ہیں۔ جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے۔

قُلْ اَدْعُوا اللّٰهَ اَوْ اَدْعُوا الرَّحْمٰنَ اِلٰهًا يَّحْيِيْكُمْ
مَدْعُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ اِلٰهَ الْحَقِّ وَلَا تَجْهَرُوْا بِصَلٰتِكُمْ
وَلَا تَخٰنْتُمْ بِهَا وَاَبْتِغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا وَاَقُلِ
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَاَلَمْ
يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمَلٰٓئِكَةِ وَاَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ
وَلِيٌّ مِّنَ الدَّٰلِ وَكَبُوْرُهُ تَكْبِيْرًا (اسرائیل: ۴۰)

کہا اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو کہہ کر پکارو سب
اچھے نام اسی کے ہیں، اپنی نماز نہ بہت زور پڑھو اور نہ
بہت چپکے، بیچ کی راہ تلاش کرو اور کہہ کر مجلس اللہ کی
جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا، اور نہ سلطنت میں کوئی اسکا
شریک ہے۔ اور نہ در ماندگی کے سبب اس کا کوئی مددگار
ہے۔ اور اس کی بڑائی کو، بڑی بڑائی۔

چونکہ اس کی یہ حمد سورہ فاتحہ میں بر تمام و کمال مذکور ہے اس لیے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں،
اس کے بعد قرآن میں سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس کو پڑھتے ہیں، پھر خدا کے اسما و صفات سے جھک
جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں۔

وَازْكُفُوْا مَعَ التَّوٰكِيْعِيْنَ (بقرہ: ۵)

اور رکوع کرنے والوں کیساتھ رکوع کرو۔

پھر اس سے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا اَنۡ سَجَدُوْا وَاَعْبُدُوْا
رَبَّكُمْ وَاَقْلُوْا الْخَيْرَ لِقَوْلِمْ لِقَوْلِمْ لِقَوْلِمْ (حج: ۱۰)

اے ایمان والو! اللہ کو یاد کرو اور سجدہ کرو اور اپنے
رب کی پرستش کرو اور ایک کام کرو تاکہ کامیاب ہو۔

ان دونوں (رکوع و سجدہ) میں خدا کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔

سَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (واقعہ: ۲۰، ۲۱)

تو اپنے بزرگ پروردگار (سبحان) کے نام کی تسبیح کرو۔

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (اعلیٰ: ۱)

اپنے برتر رب (رب اعلیٰ) کے نام کی تسبیح کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے۔

قیام، رکوع اور سجدہ کی یہ ترتیب سورہ حج ۴۰۔ ذکر ابراہیم، اور آل عمران (۵۰۔ ذکر مریم) سے اور پیام کہ سجدہ

پر ایک رکعت تمام ہوتی ہے سورہ نساء (۱۵۰۔ ذکر نماز خوف) سے ثابت ہے۔ درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب

بالکل فطری اور عقلی ہے۔ پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدے میں گر پڑنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب

ہے، تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے، جب کیفیات اور جذبات میں گہرائی

پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے اور جب فطرطیہ خودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصہ جسم

(یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظّم کے پست ترین حصہ جسم (یعنی پاؤں) پر رکھ دیتا ہے، یہی سبب ہے کہ

سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے، قرآن نے کہا ہے۔

لے ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب التسبیح فی الركوع والسجود

اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (علق: ۱)

گویا سجدہ قربت الہی کی اخیر منزل ہے، شاید اسی لیے وہ ہر رکعت میں مکرر ادا کیا جاتا ہے۔

نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے | قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے، جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر ہلکانے اور سرنگوں کرنے کا حکم ہے۔ مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے خدا کی تسبیح اور تحمید کا ارشاد ہے، دعا اور استغفار کی تعلیم ہے، دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے، رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے، اس لیے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہو گئے۔ اسی لیے ایک نماز قرآن کے تمام گونا گوں جسمانی، لسانی اور روحانی عبادت کا مجموعہ ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قراءت قرآن، ذکر الہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کیے گئے ہیں ان کی مجموعی تعلیم کا نام نماز ہے، جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہیں، دوسری طرف ان احکام کی یکجا آوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے رکوع کر لے، جو چاہے سجدہ کر لے، جو چاہے صرف قیام کرے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر و قراءت پر اکتفا کر لے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کرے اس فرعون سے ادا ہو جائے تو ہر فرد سے فریض الہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جن پر کبھی عمل نہ ہوتا اور بچ نہیں کہ افراد کی طبیعتی اور سہل انگاری ان پورے احکام کی تعمیل میں مانع آتی، سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی نہ جماعت ہو سکتی۔ اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادت خاص کہا جاسکتا اور نہ جماعتی رمز و شعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو وحدت بنائی اور جاتی۔ اللہ تعالیٰ کے اپنے فرشتے کے ذریعے اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت نے نسلاً بعد نسل موجودہ اور آئندہ نسل کو سکھایا اور اس پورے تو اتر عمل کے ساتھ جس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں، وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا | نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جاسکتی ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسیوں مختلف دعائیں مروی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے جس کے نماز کے پڑھنے کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جس کو آپ نے تمام نماز کی رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے لیکر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں، وہ سورہ فاتحہ ہے جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے اسی لیے وہ اسلام میں نماز کی اصلی دعا ہے، یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی

اللْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے،

مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ

نَسْتَعِينُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ

الْمُنضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (فاتحہ، ۱)

رحم والا مہربان ہے، ہمارے مل کے بدلے کنے

کا مالک ہے، (اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد

مانگتے ہیں تو ہم کو راستہ سیدھا پر ہلا، انکارستہ جن پر تیرے فضل

کیا، انکارستہ نہیں جن پر غضب ادا نہ ان کا جو سبک گئے۔

اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں، یعنی اسے خدا تو اس کو قبول کرے

یہ وہ دعا ہے جن کو ہر مسلمان، ہر نماز میں دہراتے ہیں جس کے بغیر ہر نماز نامتام اور دھوری رہتی ہے۔ یہ دعا امام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و ستائش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا یقین ہے، عبادت کا فلسفہ ادا کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھلوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے جو سنت اس حمد میں خدا کی پہلی صفحت کل جہانوں کا پروردگار، زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان پر پہنچی ہیں سب سامنے آجاتی ہیں جہانوں کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور بکربانی کی وسعت کا تخیل بڑا ہوتا ہے سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے انسان ہوں کہ حیوان، چمند ہوں کہ پرند، پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب، مخدوم ہوں یا خادم، بادشاہ ہوں یا گدا، کالے ہوں یا گورے، مغرب ہوں یا مجرم، کل مخلوقات، خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے، خدا کو رحمت رحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت، بے پایاں شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابل بیان کینہ محبت کا سمندر دل کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے، روز جزا کے مالک کا خیال ہم کو اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مؤخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے ہم تجھی کو پوجتے ہیں کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں "بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناپ چیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیاز مند بن جاتے ہیں سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں یہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) کیا ہے، اس کی شریعت کے احکام ہیں۔

قُلْ نَعَالُوا اَللّٰهُ مَا خَوْنُمْ وَبِكُمْ عَلَيْنَا اَلَّذِ

نَعْمَ كُنَّا بِيْهِ شِيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّلَا

تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ طَحْنٌ نُّوْرُكُمْ

وَاِيَّاكُمْ جَزَاةٌ تَقْرَبُوْنَ اَللّٰهُ اِحْسَانًا طَهْر

مِنْهَا وَمَا بَطْنٌ ۚ وَّلَا تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِي

حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۗ ذٰلِكُمْ وَّضَعْتُمْ بِيْه

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۗ وَلَا تَقْرَبُوْا اِمَّاٰلَ الْيَتٰمِيْهِمْ اِلَّا

کہہ دے (اے پیغمبر!) آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں جو

تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ

شرک نہ کرو۔ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت کے

سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور انکو روزی

ہیں بے حیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ وہ ظالم ہیں

دغش) ہوں یا باطن میں، جس جان کو خولنے محترم کیا، اسکو

مت مارو لیکن انصاف کے ساتھ۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا

بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ لَنْ وَأَوْفُوا
 الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْعِصْطِ لَنْ تَكْفُفُ نَفْسًا إِلَّا
 وَسَعَهَا وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْبُدُوا ذُلُوكَانَ
 ذَا قُرْبَىٰ وَرَبِّعَلَدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَلِكُمْ
 وَصَلُّوا لَهُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ه
 وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ
 فَاتَّبِعُوهُ ۝

(الانعام، ۱۱۰)

خدا نے تم کو حکم دیا ہے شاید کہ تم کجگو اور یتیم کے مال کے
 پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے، یہاں تک کہ وہ اپنی
 قوت کو پہنچ جائے اور ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا
 رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ حکم نہیں دیتے جب تم
 بات بولو تو انصاف کی، گو وہ تمہارا عزیز ہی کیونہ ہو۔ اور خدا
 کے عہد کو پورا کرو۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا،
 تاکہ تم نصیحت پکڑو اور کبھی یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراط
 مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو۔

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحی محمدی کی اصطلاح میں صراطِ مستقیم کیا ہے یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کیساتھ
 نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت
 کرنا، ناحق قتل نہ کرنا، یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمان داری، بلاؤں اور رعایت سے بچنا، اور عہد کا پورا
 کرنا، یہ وہ صفات عالیہ ہیں جن کو صراطِ مستقیم کی مختصری ترکیب توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں جو
 اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہے۔

یہی وہ صفات حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جن پر اس کا فضل و انعام ہوا، یہ خاص
 بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے۔

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ مَا أَوْكَلْنَاكَ مَعَ الَّذِينَ
 أَلْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ
 الصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ
 وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رِزْقًا ر ۹۰ ۶

اس بنا پر ہر نمازی جس صراطِ مستقیم اور راہِ راست کے لئے دعا کرتا ہے وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے جس پر
 خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین) علیٰ قدر مراتب چل سکے۔

سیدے راستے سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی کے سبب سے) اور (۲) تفریط (کم) کے
 سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں، یہ گمراہی ہے، اور تفریط یہ ہے کہ
 خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے اور ہر قسم کا انعام و اکرام چھین لیا جاتا ہے
 پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہیں جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کر دیں، دوسری کا نمونہ
 یہود ہیں جنہوں نے احکامِ الہی کو پس پشت ڈال دیا اور ہر قسم کا انعام و اکرام سے محروم ہو گئے، مسلمانوں کی یہ
 دعا ہے کہ الہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اسلام کی یہ دعا (سورہ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤں کی جامع، جسم و روح کی

نیکیوں پر مشتمل اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے، اس میں خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التماس بھی، اسی لئے
 ہجرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے اس کی نسبت فرمایا :-

”جو نماز میں اس سورۃ کو نہ پڑھے، اسکی نماز ناقص اور نامکمل ہے، خدا فرماتا ہے کہ نماز میری اور میرے بندے کے درمیان
 دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، آدھی میرے لئے ہے اور آدھی اس کے لئے۔ بندہ جب الحمد للہ رب العالمین (حمد ہوسکے
 جہانوں کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے میرے بندہ نے میری ستائش کی“ پھر جب وہ الرحمن الرحیم (مہربان رب عالم
 کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے ”میرے بندہ نے میری تعریف کی پھر وہ کہتا ہے مالک یوم الدین (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک)
 تو خدا فرماتا ہے ”میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی“ اتنا میرا حصہ ہے اور میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک
 یہ ہے کہ ایک نعبہ و ایک نستعین (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اور اس کے بعد آخر تک
 رکھ ہم کو صراطِ مستقیم دکھا، میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندے نے جو مانگا وہ اس کو ملا“

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اس دعا کو جو دلکش و دل فریب نظارہ نظر آتا ہے وہ ہر جہان میں مثال
 اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے، یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور، ایک عیسائی یورپین فاضل آجی وینٹک
 کو بھی جس نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک بڑی معلومات مضمون لکھا ہے سٹوڈی ویر کے لئے ہو جاتا
 ہے، وہ لکھتا ہے :-

”اسلام کی رو سے نماز حضور قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہیے، ایک دفعہ محمد نے ایک پُرعشق و نگار کپڑے کو اسلئے
 اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے۔ یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ اسمیں دلی حضور و
 شروع کی بھی ضرورت ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے، جس میں محمد نے کہا ہے کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسندیں تھیں
 اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے“ محمد پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے
 نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے جس کو ہم ان دھندلیوں میں پاتے ہیں جن میں بیان ہے کہ نماز خدا سے سرگوشی
 اور مکالمہ ہے“ اور اسکی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ ”سورۃ الحمد میرا اور میرے بندے کے درمیان بٹی ہوئی ہے“

اس دعائے محمدی کا موازنہ دوسرے دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا، جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز میں
 انبیاء کی مخصوص دعاؤں سے پڑھنے کے لیے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو، گوہ طور پر جلوہ زبانی کے وقت
 حضرت موسیٰ نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراہ کی کتاب شروع میں موجود ہے، ذبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ
 ہی ہے مگر اسمیں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ داؤد کی نماز“ انجیل میں حضرت عیسیٰ اپنی دوامی شب میں
 حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزو ہے، ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر
 محمد رسول اللہ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیر کی کیفیت، حسن تدبیر، جامعیت، پاکیزگی اور
 اختصار کا اندازہ ہو گا اور پتہ چلیگا کہ اسکی کیا بیثالی ہے جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لیے اسکی کا انتخاب ہوا،
 اسی لئے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابی بن کعب سے فرمایا تھا کہ نماز میں

لہ جامع تہذیبی تفسیر فاتحہ و مسناہن جنبل ج ۲ ص ۳۶ مصر ۱۰۰۰ یہ حدیث اور پر گندھکی :-

جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ تورات میں اتری نہ انجیل میں، نہ زبور میں اور نہ اس کے مثل کوئی چیز خود قرآن میں موجود ہے۔ اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

حضرت موسیٰ کی نماز کی دعا | تورات کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ توراہ لینے اور بانی تہجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لیے گوہر پر چڑھے اور تہجلی نظر آئی، تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دعا تعلیم کی۔

خداوند، خداوند، خدا، رحیم اور مہربان، قہر میں دھیم اور رب فیض و وفا، ہزار پشتوں کے لیے فضل رکھنے والا، گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا، لیکن وہ ہر حال میں معاف نہ کرے گا بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا۔ (۶۰-۳۳)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت مؤثر ہیں لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے، پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں بابِ اجابت پر فضل چڑھا دیا ہے۔

زبور میں حضرت داؤد کی نماز کی دعا | زبور باب ۸۶۔

داؤد کی نماز

اے خداوند! اپنا کان جگا اور میری سن کہ میں پریشان اور مکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کہ میں دیندار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جسا توکل تجھ پر ہے۔ رہائی دے اے خداوند! مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے ناکہ کرتا ہوں۔ اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند! میں اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہوں کیونکہ تو اے خداوند! بھلا ہے اور بخشنے والا ہے اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں "وا فر ہے۔"

اے خداوند! میری دعائیں اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر۔ میں اپنے بپت کے دن تجھ کو پکاروں گا کہ تو میری سنی گا۔ معبودوں کے درمیان اے خداوند! تجھ سا کوئی نہیں اور تیری صفیتیں کہیں نہیں، اے خداوند! ساری قومیں جنہیں تو نے خلق کیا آئیں گی۔ اور تیرے آگے سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی۔ کہ تو بزرگ ہے اور بجا تب کام کرتا ہے تو ہی ایسا خدا ہے۔

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ دکھا، میں تیری سچائی میں چلوں گا۔ میرے دل کو یکطرفہ کر، تاکہ میں تیرے نام سے ڈروں، اے خداوند! میرے خدا! میں اپنے سارے دل سے تیری تائش کروں گا اور اب تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دلا۔ اے خدا! مغروروں نے مجھ پر چھائی کی ہے اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور

جامع ترمذی، فضائل سورہ فاتحہ :

انہوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا لیکن تو اے خداوند! خدا رحیم و کریم اور بڑا شاکر ہے والا ہے اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے، میری طرف توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا تاکہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں دیکھیں اور شرمندہ ہوں کیونکہ تو نے اے خداوند! میری مدد کی اور مجھے تسلی دی۔

اس دعا میں بھی وہی خدا کی حمد و صفت اور توحید و عبادت کا ذکر، ماوراست کی ہدایت کی طلب اور شریروں اور گمراہوں کو بچانے کی درخواست ہے، لیکن طول، تکرار اور دہرا لگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہیں بن سکتی، اور نہ اس کا طول اسکو ہر وقت کی نماز میں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے۔ انجیل میں نماز کی دعا | حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریوں کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہیں :-

اے ہمارے باپ! جو آسمان پر ہے تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آدے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہماری قرض ہمیں معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے "آمین۔"

نام کی تقدیس، خدا کی حمد، بادشاہت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے جو دہلے قرآنی میں مابلکہ یحکم الدین کے لفظ سے ادا ہوا ہے، نیز استغفار کی زبان میں روز کی روٹی سے مراد دنیاوی روٹی نہ بلکہ بلکہ روح کی غذا یا صراطِ مستقیم لیجانے، اور قرض سے مراد فرائض اور حقوق لیے جائیں جو خدا کی طرف انسانوں پر عائد ہیں۔ آزمائش میں نہ پڑنے اور برائی سے بچنے کے معنی وہی لیے جاسکتے ہیں جو اسلامی دعوے کے خاتمہ میں مذکور ہے کہ یہ انکارا ست ہے جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستے سے ہٹ گئے ہیں :

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ پیر چاروں دعائیں جو چار اولوالعزم پیغمبروں کی زبان نبوت سے ادا ہوئیں، قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تکمیل دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آسکتی ہے، دہلے محمدی تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر ہے، تاثیر سے لبریز ہے، خدا کی تمام صفات کا ملکہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکام شریعت کی جامع ہے، اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمائندگی کر سکتی ہے۔ وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت قرض لینے پر آمادہ کرتے ہیں، نیز وہ خدا کی رحمت عام کو ایسے عنوان سادہ کرتی ہے جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے، خدا کی وہ تین صفیتیں جن کا تصور رکھے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا (یعنی ربوبیت، رحمت اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت میں وہ تمام صفیتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لیکر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ مالگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی صفیتوں کی نیزنگیاں ظاہر ہوتی ہیں، مالکیت اسکی تمام جلالی صفیتوں کا منظر ہے اور پوری سورہ

دعا کے انغراض ثلاثہ حمد، اچھائیوں کے لیے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے۔ طرز بیان خدا اور بندہ کے شایان شان ہے، درخواستیں حد درجہ مؤدبانہ ہیں، اوصافِ الہی وہی ہیں جو ایک دنا کے مناسب ہو سکتے ہیں، دعائیں محوم ہے وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے، للہیت اور روحانیت کا کمال، منتہائے نظر ہے، اس لیے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے، خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤں میں کیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے یعنی دونوں حصوں نے مناسبت کے ساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شرفقت و رافت اور بندہ کے خشوع و خضوع، بندگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع، مختصر اور پُر اثر بیان، سورہ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے۔

نماز کی تعیین اوقات کی ضرورت نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقات نماز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا اس لیے کسی کام کے کرنے کے لیے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لیے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کامل کو لیکر مبعوث ہوئے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ علی ہے، محض نظری نہیں، اس نے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ انسان روزانہ اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسی (سائیکولوجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کیساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کرے کبھی وہ اسکو مستعدی کیساتھ بلاناغہ انجام نہیں دے سکتا اسی لیے ہر منظم، باقاعدہ اور دائمی عمل کے لیے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے ناطق اور منظم کاموں کے لیے اختیار کیا ہے۔ ایسے اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکو کسی کام کے کرنے کے لیے ۲ گھنٹوں کی مہلت ہے تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر مالتا جاتا ہے، یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھڑی بھی گزر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لیے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کافرشتہ ہر وقت انسان کے فرض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلاناغہ انجام پاتے جاتے ہیں۔

اوقات نماز کے تقریر میں وہ چیز بھی مد نظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی اصول وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے مسلمان مختلف شہروں، ملکوں اور اقلیموں میں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے۔ کرہ ہوا میں لگی ہوئی دو بین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع میں، ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرنگوں پاؤں گے اور جہاں تک مطلع و مغرب میں نمایاں فرق نہ ہو گا ایسی منظر لاکھوں کے سامنے رہے گا، مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے جب دوسری جگہ بھی اسی

حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اس وقت و مل ادا ہوتا ہے۔ یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقریب کے بغیر ممکن نہ تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحہ ۱۰۷ یعنی تو کجا ایک محلہ ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آسکتے تھے۔ نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں | اسی لیے اوقات کے تقریر اور تعیین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے اور اپنے اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع و مغرب کے وقت پر جاپاٹ کرتے ہیں، زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمزمہ خواں ہوتے ہیں رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے، پھر شام کو، پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہیں، یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو لفظاً کہتے ہیں، دانیال نبی کی کتاب میں ہے :-

”جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کونٹری کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا، کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور میں جسطرح سے پہلے کرتا تھا دعا اور شکر گزاری (حمد) کرتا رہا..... پھر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے۔“ (۶-۱۰ تا ۱۳)

حضرت داؤد کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے :-

”پیر میں خدا کو پکاروں گا، تب خدا مجھے بچا لیا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا سو وہ میری آواز سن لے گا۔“ (۵۵-۱۶، ۱۷)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں ہے :-

”پھر اس نے (حضرت عیسیٰ نے) اس لیے کہ انکو ہمیشہ دمایں گے رہنا اور سستی نہ کرنا، ضرور ہے ایک تمثیل کہی (۱۰-۱۸) حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز ان کے دل بھی تھی چنانچہ اعمال میں ہے :-

”پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا۔“ (اعمال ۱۰-۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھانے بھی گئے، ایک جگہ ہے۔

”پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر بیکل کو چلے۔“ (اعمال ۱۰-۲)

یونانی میں تیسرے پہر، بجائے نویں گھڑی کو لکھا ہے، جس کو ہم عصر کہتے ہیں، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰-۳ میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپ نے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہتر وقت آدھی رات ہے۔

”اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا جب مانگ چکا، ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس سے کہا کہ اسے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت عیسیٰ) نے اپنے شاگردوں کو سکھایا اس نے ان سے کہا جب تم

دعا مانگو تو کہو... اس نے ان سے کہا، تم میں سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدمی رات کو اس کے پاس آکر کہے اے دوست! مجھے تین روٹی ادھا روے (لوقا۔ ۱۱)

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے چنانچہ جس شب کو انہیں گرفتار کیا گیا وہ ایک جاہل کے ساتھ اسی نماز تہجد میں معروف تھے (لوقا ۲۲-۲۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے۔ مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے: اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی: "بلکہ عزنی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے ہوا ہے: یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو ماٹا اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس میں اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے: وینی الصبح باکوا قام وخرج الی موضع خلاد وکان یصلی ہناک یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کر لیں تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵-۱۶، ۱۷) میں، صبح کا مرقس (۲۵-۱) میں، عصر کا اعمال (۱-۳، ۱۰-۱۲، ۲۰) میں ہے اور عشاء (رات) کی نماز کا لوقا (۱۱-۲۲، ۳۹) میں نماز کے لیے مناسب فطری اوقات | اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز نماز

دعا و نماز میں معروف رہتا مگر انسان کی فطری و فطری ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا اس لیے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لیے چند مناسب اوقات مقرر کر دیے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سناٹا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھاپنی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لیے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے تاکہ پورے اوقات نماز کی یاد ہی میں محسوب ہوں، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حتی علی الصلوة کا نغمہ جانفزاساتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے۔ تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لیے بھی نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیاتِ امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے، ایسے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے بجدہ نیاز کا طغراف نقش ہو۔ اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع

ہوتے ہیں تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے اور دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہے اس لیے ضرور ہے کہ اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا بجدہ ہو۔ پھر سوتے وقت جب انسان اپنی با احساس زندگی سے کچھ دیر کے لیے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لیکر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہو نیوالی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا، اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہلے ہی جگہ پر چھوٹے رہتے ہیں۔ صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں، اسی لیے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی، اسی طرح عشاء سے لیکر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے یہ وقت صرف خواب راحت کے لیے موزوں ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں، انہیں کام کے اوقات کے شروع میں نماز پنجگانہ مقرر ہوتی ہے۔

اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ | اوقات نماز کی تعیین میں اسلام کے لیے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا منظر جب کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے، ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی، جسکی روشنی قلوب انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ و جلال کیساتھ نمودار ہوتا ہے پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکتِ غیرد کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر

سب سے پہلا موجد جس نے آفتاب پرستی گل کیا حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ملتِ ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کیے گئے، جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے تاکہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس خدائے برحق کی عبادت ہے جس کے آستانہ کمال کے بجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دین محمدی، ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لیے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی میں تھے۔ دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پر وہ عدم میں روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی دو تین دور ہوتے ہیں، جب سررسمت (الراس) سے نیچے اترتا ہے، جس کو زوال کہتے ہیں، جب آنکھوں کے دائرہ تقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دائرہ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں، آفتاب کے ان تینوں اوقات انحطاط میں ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہو جاتا ہے اس وقت عشاء کی نماز ادا

کی جاتی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے :-

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِ النَّهْسِ إِلَى
غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنِ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل: ۹۰)

نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت، سات
کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز۔

تفصیل آگے آتی ہے۔

عرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے سہتر تریکی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات میں ہیں، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلنے وقت، اس کے عروج و کمال کے وقت اور اس کے ٹھیک ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں۔

اسلام میں طریق و اوقات نماز | نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں اور کس کس رکعتیں کر کے پڑھنی چاہیے اور اس کے کیا کیا اداب و شرائط ہیں ان سب کے لیے قرآن پاک میں ایک جامع آیت ہے جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلے میں مذکور ہے۔

حَا فِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الَّتِي تَنْسَلُونَ
وَقَرُّوا فِيهَا نَبَاتِينَ، لَنْ نَحْضَمَّ فَرْجًا لَّا
أَوْذُكُنَا فَاذًا أَمْنَةً فَاذُ كُرُوا اللّٰهَ
كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (بقرہ: ۲۳۸)

نمازوں پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو اور اللہ کے
لیے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر دو شخصوں کا
خوف ہو تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھو) پھر جب
تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح
اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے۔

اس آیت پاک سے یہ بات بصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہیے، خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے، جس طرح خود قرآن پاک کی، اس اجمال کی تفصیل سنت نبوی کے ذریعہ احادیث میں تحریر کیا اور مسلمانوں کے نسل بعد نسل متفقہ طور پر عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآن پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں۔

نمازوں کی پابندی و نگرانی | اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازوں کو پابندی سے ادا کریں، ان کی نگہداشت رکھیں اور ان پر مداومت کریں۔ قرآن پاک میں نماز کی پابندی نگہداشت اور مداومت کے لیے ایک خاص لفظ، محافظت کا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہیں، فرمایا :-

حَا فِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ (بقرہ: ۲۳۸)

نمازوں کی نگرانی رکھیے۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ (معاذ: ۱)

اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم کتاب الصلوة، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵،

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل | اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس مغرب، منظر عمومی اور بے سرو سامانی کے ساتھ ہوا تھا اس لیے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہیں اور اوجھڑ چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، سورہ منزل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے یہ آیتیں آئی ہیں:

يَا أَيُّهَا الْمَرْءُ الْمَثَلُ لَا قِيلَ لَكَ
لِصَفَةِ أَوْ أَنْفَعُ مِنْهُ قِيلَ لَكَ أَوْ ذُو عَلَيْهِ
وَرَقِبِ الْقُرْآنِ تَرْتِيلًا وَأَنَا سُلَيْمِي عَلَيْكَ
تَوَلَّوْا قِيلًا إِنَّ مَأْسُومَةَ أَيْلِ هِيَ أَسَدُ
وَطَاوَأَوْ قَوْمٌ قِيلًا إِنَّ لَكَ فِي الشَّهَارِ
سَبْحًا طَوِيلًا

(منزل ۱۰)

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت بر ملا نہیں دی جاسکتی تھی، کیونکہ جہاں سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، وہیں یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزْمِ الرَّحِيمِ الَّذِي يَزِيكُ
جِئِن تَقُومُ لَا وَتَقَلْبِكَ فِي السَّاجِدِينَ
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (شعراء: ۱۱)

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلان دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے اور کون سویا ہوا ہے، جس کو نماز کے لیے جگانا چاہیے، ایسی پرخطر حالت میں آپ کا راتوں کو تن تنہا یہ فرض انجام دینے کے لیے نکلنا اس الٹا دپر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا، اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی۔

وَأَصْبُرَ الْحُكْمَ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا
وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ لَوْ مِنْ
الْأَيْلِ قَبْلَهُ وَأَزْدُ بَارِ النَّجُومِ.

(طور: ۲۰)

اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار رکھیں، جیسے تو پہلی آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کرو۔ جب تو رات کو تہجد کے وقت اٹھتا ہے اور کچھ بات کے حصہ میں اسکی تسبیح کرو اور ستاروں کے چٹپٹے پھرتے وقت۔

یہ آیت سورہ طور کے آخر میں ہے اور سورہ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا کیونکہ اس سورہ میں اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلہ الہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے، سورہ دہر میں جو صبر کے نزدیک کی ہے اور غالباً سورہ طور کے بعد آتی ہے انہیں معنوں کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہتے اور بڑھتی ہے۔

فَأَصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطْعَمْ مِنْهُمْ
إِنَّمَا أَزْكُوا كَفُورًا، وَأَذْكَرُوا سَمْرًا رَبِّكَ بَلَاغًا
وَأَصِيلًا وَمِنْ أَيْلٍ فَأَنْجِدْ لَهُ وَبَسْتَهُ
لَيْلًا طَوِيلًا.

(دہر: ۲۰)

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب مگر ہونہ "اصیل" میں ظہر و عصر اور "من ایل" رات، میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں ہوتی تھی کیونکہ کل تین نمازیں تھیں، ایک فجر کے وقت ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو، اسی لیے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب یہ ان تین وقتوں کی تسبیح و تحمید باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہیں، حکم ہوتا ہے:-

أَقْبِرِ الصَّلَاةَ طَوِيلًا الشَّهَارِ وَزُلْفَا صَوْتِ
الْأَيْلِ (ہود: ۱۰)

یہ آیت سورہ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کر کے

کہ صبح بخاری تفسیر طور واقعہ جبر بن مطعم سے "اصیل" دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہوا ہے اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی شش ٹکے ہیں جو عصر کے لیے سورہ روم میں استعمال ہوا ہے۔ طرفی النمار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں اٹا کیا گیا ہے۔ قبل طلوع شمس و قبل غروبھا۔ بالعمی والابکار بالغدو والأصال۔ اسیں پہلا طرف فجر، بکرہ اور غروب، دوسرا طرف عصر، شش اور اصیل ہے۔

اوقات پنجگانہ اور آیت اسراء | محمد شہین اور مورخین کا اتفاق عام ہے کہ نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی، گو اوقات پنجگانہ کا ذکر سورہ ق اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں لیکن اقامتِ مصلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورہ اسراء (معراج) میں نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورتِ مصلوٰۃ اسی معراج میں ہوئی، جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا مگر اسکا حکم قرآن میں یعنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے سورہ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس میں نماز پنجگانہ کا ذکر ہے حسب ذیل ہے :-

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوٰكِ الشَّمْسِ اِلَىٰ
عَسَقِ الْيَلْبِ وَقُرْآنِ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْآنَ
الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (اسراء: ۹)

آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک
نازکھڑی کر اور فجر کی قراءت قائم کر، بے شک
فجر کی قراءت میں حضور ہوتا ہے۔

یہ آیت کریمہ اوقات پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے اس میں سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ "دلوک" ہے۔ دلوک کے اصلی معنی "جھکنے اور مائل ہونے" کے ہیں لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ "دلوک الشمس" یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے اور اہل عرب اسکو کن معنوں میں بولتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ معراج میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر، مقابل نقطہ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور مغرب پر، اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی۔ فرض یہ کہ اورج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں، ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطہ تقابل سے اور تیسرا دائرہ افق سے۔ پہلا نظر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا اور تیسرا مغرب کا اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی فدائی کی نفی و تردید، اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لیے ایک ایک نماز رکھی ہے، اس طرح "دلوک" کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں۔ چوتھی نماز کا وقت "عسق الیل" رات کی تاریکی ہے۔ یہ عشاء کی نماز ہے اور اسکو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہیے، جب آفتاب کا چہرہ نورانی تو برتو جو باہت ظلمت میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی تاکہ خواب کی غفلت کی تلانی اس سے ہو جائے اور پانچویں نماز کا وقت

دقیقہ حاشیہ صفر سابقہ رکھیں اتنی ہی رہتی تھیں، صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی، فقہاء میں ماہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جاسکتا ہے، احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر چھ میں عرفات میں ذی الحجہ کو ظہر اور عصر و نفل ظہر کے وقت ادا کی جاتی ہیں کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کیلئے ہے بقیہ نمازوں میں تنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجا نہیں بلکہ معنی صورتہ دو دو نمازیں ایسا تھ ادا کی جاسکتی ہیں اسکی صورت یہ ہے کہ ایک نماز آخر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے، حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک سفر میں حقیقتہً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جاسکتی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے شیعوں میں دو دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے :-

قرآن الفجر د صبح کا پڑھنا بتایا گیا ہے۔ یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ عنقریب وہ ناپہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا جائے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالق اکبر کا نام لے لے اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں تبری ظاہر کرے۔ بغرض اس آیت پاک سے اقامتِ مصلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے، اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلام عرب میں آفتاب کے ان تنزل جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے، اگر کلام عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات پنجگانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق | مفسرین میں سے بعض نے "دلوک" سے زوال کا وقت اور بعض نے مغرب کا وقت مراد لیا ہے، اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں، اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کیے ہیں یعنی مقابل نقطہ نگاہ سے ہٹ جانا اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے چنانچہ لسان العرب میں ہے:

ودلکت الشمس قد لك دلوكا مغرب وقيل
اصفرت ومالت للغروب، وفي التنزيل
العزیز اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوٰكِ الشَّمْسِ
اِلَىٰ عَسَقِ الْيَلْبِ "وقد دلکت زالت عن
كبد السماء.... وقال الفراء عن ابن عباس
فی دلوك الشمس انه زوالها الظهر. قال و
رایت العرب یذهبون بالذلوك
الح غیاب الشمس. قال
الشاعر :-

هنا مقام قد می رواج
ذبح حتی دلکت بواج
یعنی الشمس

قال ابو منصور وقد روينا عن ابن مسعود انه
قال دلوك الشمس غروبها وروی ابن هانئ
عن الا خفش انه قال دلوك الشمس من
زوالها الى غروبها، وقال الرجاج دلوك
الشمس زوالها فی وقت الظهر، وذلك
میلها للغروب وهو دلوكها ایضا يقال دلکت
بواج وبواج. ای قد مالت للزوال حتی کا د

آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ مغرب ہوا اور کہا گیا ہے
کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہو گیا اور مغرب کیلئے
جھک گیا اور قرآن میں ہے کہ دلوک شمس کے وقت
رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کرو اور آفتاب کو دور
ہوا یعنی وہ آسمان سے چھٹ گیا... اور فراء
نے کہا کہ ابن عباس نے روایت ہے کہ دلوک شمس کے معنی
ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں اور اس کے بیان
کیا کہ میں اہل عرب کو دلوک سے آفتاب کا مغرب سے لڑتی
دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے :-

یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رواج کے دو نفل قدم
جھٹے اٹنے دشمنوں سے اپنی عزت کی حفاظت کی،
یہاں تک کہ سوزج ہتھیلی سے جھک گیا۔

ابو منصور نے کہا کہ ہم ابن مسعود روایت کی ہے کہ
دلوک شمس، آفتاب کا مغرب ہے اور ابن ہانئ نے
انفس سے نقل کیا ہے کہ دلوک شمس ظہر کے وقت آفتاب کا
زوال ہے اور اس کے معنی مغرب کیلئے جھکا بھی ہیں اور یہ بھی
اسکا دلوک کا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ دلکت بواج
بواج یعنی آفتاب زوال کیلئے جھک گیا یہاں تک کہ
دیکھنے والا جب اسکو دیکھنا چاہے تو اسکی کرن کی شدت

الناظر محتاج اذا تبصره ان يكسر اشعاع من
بصره بواحته فان قيل ما معنى الدلوک
فی کلام العرب قيل الدلوک الزوال لذلك
قيل للشمس اذا زالت نصف النهار
واللکة وقيل لها اذا اقلت دالکة لانها
فی الحالتين ذائلة
قال الفراء فی قوله بواحه جمع داحة
وهی الکف بقول یضع کفه
على عينیه ينظر هل مغرب
الشمس بعد .

کو توڑنے کیلئے اس کو آنکھ پر تھیلی رکھنے کی ضرورت
ہے تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک
کیا معنی میں تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال
کے ہیں اور اسی لیے آفتاب کو ذالکہ کہتے ہیں جب وہ
دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے
تب بھی اسکو ذالکہ کہتے ہیں کیونکہ وہ ان دونوں حالتوں
میں جھک جاتا ہے ... فرار نے کہا کہ اس قول (شعر) بواحه
میں جو بواح کا لفظ ہے بواحہ کی جمع ہے جس کے معنی تھیلی
کے ہیں کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں
پر تھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب بھی غروب ہوا یا نہیں :-

شعر نے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجھلنے کے وقت آنکھوں پر تھیلی رکھنے کا
اکثر ذکر کیا ہے۔ بواج کہتا ہے :-

والشمس قد کادت تتكون دلفا ادفعها بالسواح کى تزحلفا
اور آفتاب قریب تھا کہ بید ہو جاتا ہے۔ میں اس کو تھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ ہمیں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت
مراد ہے جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے، الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے
بہرہکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے۔ اسکا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے۔ دوسرا
جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے
سامنے پڑتا ہے، اسوقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لیے آدمی کو آنکھوں کے اوپر تھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ
کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر
ڈوب جاتا ہے ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لیکر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں۔ بعض اہل
لغت نے جیسا کہ اوپر گذرا تھا یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں، حالانکہ اسکا اطلاق
تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے۔ اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان
پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے، اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے
غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ :-

اقبل الصلوة لذلوک الشمس
آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر

سے مراد تین نمازیں ہیں، کیونکہ تین دلوک ہوتے ہیں، نظر جب آفتاب کا دلوک دھکاؤ، سمت الراس سے ہوتا ہے۔
لہٰذا یہ شعر تفسیر طبری میں آیت مذکورہ کے تحت میں، اور لسان العرب میں دلف اور زحلف کے تحت میر، مذکور ہے :-

عصر، جب اس کا دلوک سمت نظر سے ہوتا ہے اور مغرب، جب اس کا کامل دلوک سمت افق سے ہوتا ہے، اس کے
بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرات) سے ظاہر ہے کہ عشاء اور فجر کی نمازیں مراد ہیں،
اس طرح اس آیت پاک سے جو سورہ اسماء میں واقع ہے، اوقات پنجگانہ میں اقامت صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہوجاتی ہے۔
اوقات نماز کا ایک اور راد | اس آیت کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز

ظہر (میلان اول آفتاب) سے ہوتا ہے اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہے جس میں بذریعہ جبریل نماز کے اوقات پنجگانہ
کی تعلیم کا ذکر ہے، اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے۔ پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا، ظہر کے بعد عصر پھر مغرب، پھر
سونے سے پہلے عشاء، یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلے سے ہیں اس کے بعد صبح کی نماز ہے جو عشاء سے
تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فاصلہ رکھتی ہے اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اسی قدر فاصلہ ہے چنانچہ اس آیت میں
ظہر سے عشاء تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے۔ پھر خاموشی ہوجاتی ہے،
یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے اور اسی طرح دور قائم ہوجاتا ہے پھر ظہر
ظہر سے عصر، عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے،
صبح آٹھ گھنٹے کی یاد ہوتی ہے اور پھر انسانی کاروبار کے لیے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے جو صبح سے ظہر تک ہے اور
اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے۔

اوقات پنجگانہ کی ایک اور آیت | سورہ اسماء کی آیت کی طرح سورہ ظہر میں بھی ایک آیت ہے جس
میں اوقات پنجگانہ کی تفصیل ہے، وہ یہ ہے :-

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ
وَقَبْلَ غُرُوبِهَا، وَمِنْ آنَاكِ اللَّيْلِ
فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ (ظہر: ۸)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ، آفتاب نکلنے سے پہلے
اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے اور رات کے
کچھ وقت میں تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشاء مراد ہے اور دن کے
کناروں میں ظہر اور مغرب ہے۔
اطراف النهار کی تحقیق | یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اطراف کا لفظ جمع ہے جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے،
اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں صبح اور شام، یا تین ہیں،
اگر دوسرا کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح، دوپہر اور شام، پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہوجاتا ہے اور ظہر
غائب ہوجاتی ہے، دوسری شق اختیار کی جائے تو ظہر آجاتی ہے مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہے۔

لے تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انھیں نمازوں کا باختلاف روایت مراد ہونا مذکور ہے۔ حضرت ابن مسعود دلوک غروب
آفتاب اور حضرت ابن عباس زوال آفتاب مراد لیتے ہیں اسی طرح غسق اللیل کو بھی بعض لوگ مغرب اور بعض عشاء سمجھتے ہیں اور فیصلہ
یہ کرتے ہیں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشاء اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے اور اس طرح ان کے
نزدیک بھی یہ آیت اوقات پنجگانہ کو بتاتی ہے۔ لے سیرت ابن ہشام باب ابتداء فرضیت صلوٰۃ :-

کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں کیا یہ سچ ہے؟ فرمایا ہاں سچ ہے، عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہاں۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ جبریل اترے اور انھوں نے میری امامت کی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی۔ یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک دو، تین، چار، پانچ گنتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہیں، نہیں رہے گا۔ فرمایا تو یہی مثال پانچوں وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے۔ اوقات کی تعیین میں فرمایا کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اس کا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آجائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے، پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے پھر جب عشاء پڑھو تو آدھی رات تک اس وقت ہے۔

ابو بزرہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قراءت کرتے تھے اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا۔ پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی۔ مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یا نہیں رہا۔ اور عشاء کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ شامل نہیں فرماتے تھے۔ حضرت جابرؓ دوسرے صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا۔ اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی بجلت اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورہ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے کبھی کوئی آیت سنی بھی دیتی تھی، مغرب میں سورۃ المرسلات پڑھی اور کبھی سورہ طور پڑھی، عشاء میں اذا السماء انشقت اور التین والزیتون قراءت کی ہے اور صبح میں سورہ طور پڑھی ہے۔

اس قسم کی اور بیسیوں روایتیں ہیں اور روایتوں پر کیا موقوف ہے اس وقت سے آج تک تمام امتیان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی تواثر دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابل تردید حجت ہے۔

۱۔ صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوٰۃ من الاسلام ص ۱۱۔ صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ص ۲۴، ۲۵۔ معرۃ صحیح بخاری ص ۱۱۔ صحیح مسلم باب قراءت الصلوات الخس کفارۃ تک صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخس ص ۱۱۔ صحیح بخاری باب وقت الظہر عند الزوال لہ صحیح بخاری باب وقت العشاء اذا جمع الناس وتاخر واثقہ ايضا باب القراءۃ فی الظہر والعصر والمغرب والعشاء والخبر بروایات متعدده لہ چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ صلوة) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقات نمازیں غلط فہمی پھیلائی چاہی ہے اسلئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

تجداب نفل ہوگئی لیکن کیوں؟ اب نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوة اللیل (تجدد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کے لیے نفل ہوگئی۔ چنانچہ پوری آیت یہ ہے:-

اقبل الصلوة لیل لیل لیل لیل لیل
وقرآن الفجر ان قوائ الفجر
کان مشہوداً ومن الیل فتہجد
یہ نافلۃ تک قیل ان یتشدک
رؤبک ما تحموداً (اسراء: ۹۰)

نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر دیکھ، عصر، مغرب، رات کی تہائی تک اور صبح کی قراءت قائم کر بیشک صبح کی قراءت میں حضور ہوتا ہے اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ نماز پڑھنا شاید کچھ کو تیرا قابل تعریف مقام میں اٹھانے

غور کرو کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوتے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جا سکے پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پٹیوں والا بھول ابھی تک پنجہ کی طرح درقی برورق تھا، جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی اور حکم آیا، کہ فاقروا واما یتسرو من القرآن (یعنی قرآن سے استقدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو) اس کے بعد اس آیت پاک میں جب اقامت صلوة کے اوقات پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز (تجدد) کی فرضیت ساقط ہوگئی، یہاں ایک قابل ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیت پاک اوقات نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے کیونکہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تجدید نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی۔

قبل انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر اوقات نماز کی تعیین کی گئی ہے، ایسی حالت میں سے بھی خالی نہیں ہو سکتا۔ جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی سمت ہوگا، اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعیین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دیدی جاتی کہ جس کا جہد ہر جہی چاہے نہ کر کے نماز ادا کرے تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اور نمازیوں کی وحدت صوری قائم نہ ہوتی بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچیم، کوئی اوتراور کوئی دکھن رخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدت نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا۔ اس لیے ہر مذہب میں عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے۔ صابئی (ستارہ پرست)، قطب شمالی کی طرف منہ کرتے تھے کہ ستاروں میں وہی ہے جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا بلکہ برقرار رہتا ہے۔ آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے تھے، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں۔ اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں، اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ ناسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنا لیا تھا، شامی عیسائی بھی اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، تورا سے حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے

۱۔ صحیح مسلم ج ۱، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ حدیث ارجع فصل فافک لم تصل نیز دیکھو فتح الباری ج ۱، ص ۳۹۳ لہ الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ لہ یہ تفصیلات انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ قبلہ میں ہیں :-

اس کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر "بیت ایل" بنا لیتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے تو حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں۔

وَأَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ
(یونس: ۹)

اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کر لو اور نماز
کھڑی کرو۔

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعہ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے۔ حضرت داؤد کے زبور میں ہے:-

"لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس پہل
کی طرف۔ تجھے سجدہ کروں گا" (۵-۷)

سلاطین اول میں ہے:-

• جب تیرا گمروہ لڑائی کے لیے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے جہاں کہیں تو انہیں بھیج دے اور خداوند کے آگے دُعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لیے بنایا۔" (۷-۴۳)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے:-

"اور اس زمین کی طرف جو تو نے ان کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے تو نے چن لیا اور اس
گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لیے بنایا، تجھ سے دعا مانگیں" (۳۸)

اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی اس لیے اہل عرب کا
قبلہ کعبہ تھا اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے:-

وَلِكُلِّ وُجْهَةٍ هُوَ مَوْلَانِهَا فَاَسْتَبِقُوا
الْحَيَاتِ (بقرہ: ۱۸۱)

اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے جدھر وہ منہ پھرتی
ہے، تو اے مسلمانو! نیکیوں کی طرف دوڑو۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست، یا ستارہ پرستی سے
متاثر، پرستش کے لیے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ نہلتے تھے، مثلاً آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رخ یعنی مشرق کو
اور صابئی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے منفر یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی
بت کو قبلہ قرار دیتے تھے۔ موصوفین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے۔

ابراہیمی قوموں میں اس قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانہ کعبہ)
پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحاق اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی اس لیے وہ ان کا قبلہ تھی، دوسری مسجد
کے متولی حضرت اسمعیل اور ان کے بیٹے تھے جنہوں نے اس کو قبلہ بنا لیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک
مکہ معظمہ میں رہے، خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے

پڑھتے تھے لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور
خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک چونکہ اجازت نازل نہیں ہوئی تھی، آپ
بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے، کہ وہی انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا لیکن آپ کی طبعی خواہش
تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیمی کے لیے وہی اہل سبھی مسجد (خانہ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی
(حضرت ابراہیم) کی طرف سے بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تھی چنانچہ سورہ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام
نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے بتایا گیا کہ خدا کو کسی خاص جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بے
سمت ہے اور سب سمتیں اسی کی ہیں۔

وَاللَّهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ قَائِمًا لِّتُؤْتُوا
فَتْحًا وَجْهَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ
عَلِيمٌ (بقرہ: ۱۳۰)

اور خدا ہی کے لیے ہے یورپ اور اسی کی طرف
گرد اور اسی کی طرف خدا کا منہ ہے، بیشک اللہ بڑی گنجائش
اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ
کے تعیین کی کسی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً قرار دیتی ہے اور دوسری آیت میں
بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے:-

سَيَقُولُ الشُّفَهَاءُ مِمَّنَ النَّاسِ مَاؤَلَّهُمْ
عَنْ قِبَلَتِهِمْ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ
الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ
إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (بقرہ: ۱۷۰)

بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان
کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا، جس پر وہ تھے، کہہ
کر یورپ اور اسی کی طرف دونوں خدا کے ہیں، وہ جس کو چاہتا
ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

یہود جن کو سب سے زیادہ اعتراض یہ تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی
خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا:-

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَآتَى
الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنَ
السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ
وَالْمُؤْتُونَ
بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ
فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف
پھیرو البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتوں، کتاب
پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اسکی محبت
کے باوجود (یا خدا کی محبت پر) رشتہ داروں، یتیموں،
مغریبوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو آزاد
کرانے میں، دے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے
اور دینی یہ ہے، جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور
سخنی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے
ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے اور

الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (بقرہ: ۱۷۷) یہی پرہیزگار ہیں۔

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رخ کیا جائے عبادت کے لیے کوئی ضروری چیز نہیں ہے لیکن چونکہ نمازوں میں امت کے نظام و وحدت کو قائم رکھنے کے لیے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی اس لیے سلسلہ میں خانہ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر اور تم

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرَهُ (بقرہ: ۱۴۹) لوگ جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو۔

اسلام نے قبلہ کے لیے کسی خاص سمت کا نہیں بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا، جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جاسکے۔ اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال، سب بیک وقت مسلمانان عالم کا قبلہ ہیں، جس سے ایک لطیف مزید نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے اور اسکا دورا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب یا قطب شمالی وغیرہ) کی سجودیت اور عبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا اس کا کلیتہً خاتمہ ہو گیا۔

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں۔

۱۔ یہ ضرور تھا کہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے، ہر ملک میں منہ پھیر سکے، ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی مثلاً چراغ، کوئی مومی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گذرا، بعض اہل مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے مثلاً بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء و عناصر و کواکب، ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا، مثلاً شمال یا مشرق کہ پہلی سمت میں جگہ سے نہ ٹپنے والا۔ قطب تھا، اور دوسری چہرہ نور کشید کا مطلع اور بیاض سحر کا دیا چہ تھی، دین توحید کے لیے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے۔

۲۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جاسکتا تھا۔ مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مزاج سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لیے ضرور تھا کہ اسکی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعین آفتاب یا دوسرے منار ستاروں کا طلوع و مغرب کا لحاظ کیے بغیر ممکن ہی نہیں کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے، اس لیے جو سمت بھی اختیار کی جاتی اس سے اس سمت کا خاص ستارہ کے متعلق وجہ ترمیح کا پیدا کرنا ضروری تھا اور اس ترمیح سے دین توحید کا دین شرک بن جانا لازمی تھا۔

۳۔ اسی لیے ملت ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجدوں میں ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدیں

کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑا اہتمام سے تیار کر لیا۔ اور یہی بنی اسرائیل کا قبلہ بنی اور دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

۴۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ، بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل تھے۔

إِنَّا أَوْلَىٰ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بَيْنَكَ بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانوں کے

مُبَارَكًا (آل عمران: ۱۰) لیے (خدا کا) بنا۔ وہ ہے جو مکہ میں ہے

وَإِذِيقُوا فِعْ أَيْمَانَهُمُ الْقَوَاعِدُ مِنَ البیت و اسماعیل (بقرہ: ۱۵) اور جبکہ ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کے

الْبَيْتِ وَاسْمَاعِيلُ (بقرہ: ۱۵) کعبے اٹھا رہے تھے۔

خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جسکا انکار عمداً اسلام کے پیرو کو بھی نہ تھا۔ چنانچہ ستر آن پاک میں ہے :-

وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ اور جبکو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں، خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا حق

أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (بقرہ: ۱۴۱) ہے (اور وہ) ان کے پروردگار کی طرف سے (ہے)

پولوس (پال) ایک خط میں جو گلیتوں کے نام ہے، لکھتا ہے۔

کہ یہ لکھا ہے ابراہیم (حضرت ابراہیم) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے، دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا (اسماعیل) جہم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد تھا (اسحق) سو وعدہ کے طور پر یہ باتیں تشریح بھی مانی جاتی ہیں، اس لیے کہ یہ عورتیں وہ عمد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں اور سینا مصر کے راستے میں ہے) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام جتنی ہیں یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اس کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے (گلیتوں کے نام ۲۲-۲۶ باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو گا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بعید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں اب کے یروشلم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عمدتیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیم سے خدانے دو وعدے کیے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیم کے ساتھ مصر سے آ رہی تھیں اور راستے میں سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا تھا، اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہو گئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا۔ سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی۔ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشتر تک خدا کا عمد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا۔ چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، ترمذ، سرکشی اور قسارت

کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورہ اسراء کی آیتوں میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ماجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔

معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس سے چند سال بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بن جانا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتداء کا اعلان تھا جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں سلسلہ معراج

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ (بنی اسرائیل: ۱)

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا جسکے چاروں طرف ہم نے برکت دی ہے۔

کی تفسیر میں لکھا گیا ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیلی کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہد اسماعیلی سے تھا (یعنی خانہ کعبہ)۔ کیا تھا؛ اس کی تفصیل یہ ہے:-

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنْبَغُ لِي بِعَهْدِي الظَّالِمِينَ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ

اور جب خدا نے چند باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کو آزمایا تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا، خدا نے کہا میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا ہوں (ابراہیم نے) کہا اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہوگا اور تم ہم گھر رکھو، کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا اور تم ابراہیمؑ کے گھر سے ہوئی جگہ نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعکاف کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

(بقرہ: ۱۲۵)

غرض یہ رمز الہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا اور جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا جو تاریخی حیثیت سے دو گھر تھا جہاں گھرے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی اور دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا میں سرش الہی کا سایہ اور زمین پر حظیرہ القدس کا عکس تھا، اس لیے حکم ہوا:-

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ

اور تو جہاں بھی نکلے، مسجد حرام ہی کی طرف

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (بقرہ: ۱۴۹) منہ کر۔

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح کھڑا ہو کر فریضہ عبودیت ادا کرے جہاں حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخ ہی کر لے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لیے قبلہ کی تعیین کے موقع پر فرمایا:-

فَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا فَوَجَّهْ وُجُوهَكُمْ لِلدِّينِ الْحَرَامِ (بقرہ: ۱۴۹) پس جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔ خانہ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و معبود نہیں، نہ مشرکوں، بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دُعائیں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے نہ اس کی دُعا دی جاتی ہے، نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانہ کعبہ کی دیواریں اگر

(بالفرض) ٹوٹ جائیں اس کی چھت گر جائے اور صرف فضا باقی رہ جائے تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا، اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے، اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو ادھر ہی نماز پڑھی جاسکتی ہے، سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو پڑھ سکتے ہیں۔ گھسان کی لٹرائیوں میں بھی ایسا کیا جاسکتا ہے۔ یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہو سکتی ہیں، قطعی تردید کرتی ہیں اور یہی اس باب میں دین محمدیؐ کی نیکی حیثیت ہے۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے قدیم موجدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانان عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف رُخ کرنے کو قبول اسلام کی علامت قرار دیا اور فرمایا کہ جو ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے ہمتہ کا ذبح کیا ہو جانور کھائے وہ مسلمان ہے، اگر خیال کے پر پرواز سے اُڑ کر اور فضائے آسمانی کی نیلیگوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئیگا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے چاروں طرف تمام مسلمانان عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد ایک قیام، اس کے بعد رکوع، پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشاء کی ہر وقت چار چار اور مغرب میں تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ کر سکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بد دل بنا دے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا کیونکہ صرف چند سینکڑے میں تمام ہو جاتی اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بد دل کا باعث ہوتی کیونکہ دیر گنے کی وجہ سے جی گھبراتا اس لیے فرض نماز کی رکعتیں دو سے کم اور چار سے زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

لہ بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلة :-

وَقَوْمُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ (بقرہ: ۳۱) اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں ہاتھیں کر لیا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا کہ یہ کیسوی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف ہے۔ قرآن پاک میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں مچپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا۔ نماز کے جس قنوت کا اس آیت میں ذکر ہے اس کے متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے کیونکہ نماز میں ذکر و قنوت، تسبیح و استغفار، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے اس میں دیر تک قیام بھی ہے اور عاجزی کا اظہار بھی ہے اگر انہیں سے کوئی بھی کسی نماز میں کم ہو تو اسی قدر نماز کے اوصاف میں بھی کمی ہو جائے گی۔

حشوی ۴: تیسری چیز خشوع ہے چنانچہ قرآن پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے۔

الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (مومنون: ۱) (مومنون: ۱) خضوع کرتے ہیں۔ (وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں۔

خشوع کے لغوی معنی یہ ہیں۔ بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا، یعنی ہر اداسے مسکت عاجز اور تواضع ظاہر ہونا لسان العرب اس لیے نماز خدا کے سامنے اپنی مکین، بیچارگی اور فنا دگی کا اظہار ہے۔ اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہو گئی۔

تبتل: تبتل کے اصلی معنی کٹ جانے کے ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہوجانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔ مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے، سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے۔ چنانچہ سورہ مزمل میں ہے:-

يَا أَيُّهَا الْمَرْءُ الَّذِي كَفَرَ بِاللَّيْلِ إِذَا يَلِيْلًا يَنْفَعُهُ أَوْ تَقَعُ مِنْهُ قَلِيْلًا أَوْ يَزِدُّ عَلَيْهِ وَرَتِلَ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا إِنَّ آتَانَ سُلَيْمَىٰ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيْلًا إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا وَاذْكُرَ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (مزمل: ۱)

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اسکی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئیں، صبح مسلم میں حضرت عمر بن عبدسلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کر کے جب کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوا، پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار

کیا جسکا وہ سزاوار ہے اور اپنے دل کو خدا کیلئے ہر چیز سے خالی کر لیا (و فتوح قلبہ للہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت پیدا کیا ہو، یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔ تضرع: تضرع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی، زاری اور بجز واللحاج کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت ہونی چاہیے ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا۔

أَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً (اعراف: ۵۵) تم اپنے پروردگار کو مسکت اور زاری کیساتھ اور صغی واز سے پکارو اخلاص: نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں بلکہ ریا اور نمائش ہوگی اور بعض اہل حق کے نزدیک شرمک لازم آئیگا۔ فرمایا:-

وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ط (اعراف: ۳۰) اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو تھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ ذکر: نماز خدا کی یاد کے لیے ہے، اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی اس لیے فرمایا:-

أَتَجِبُ الصَّلَاةَ لِيذْكَرُنِي (رطلہ: ۱) میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر

ظاہر ہے کہ یاد صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہیے اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

فہر وقت بے نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہو تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا اس لیے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی مانفت کی گئی ہے کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے سپلوں میں نہیں، فرمایا:-

لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (نساء: ۴) نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کو اس کو سمجھو۔

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی مانفت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم اور تدبیر سے عاری ہو جاتا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں جب تم پر نیند غالب آجائے تو سو جاؤ۔ کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے لگو۔ دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا نماز کی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہیے تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے۔ حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے، یہاں تک کہ نماز ختم کر لے تو وہ ایسا ہو

لے صحیح مسلم جلد اول باب الاوقات التي نهي عن الصلوة فيها لکہ مسلم کتاب الصلوة باب امر من نفس في صلوة ج ص ۲۱۲ نے بخاری و ابوداؤد و مسند احمد عن النبی

پڑھی، پھر فرمایا "اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس کو ابو جہم (تاجر کا نام) کے پاس لیجاؤ اور انجانا سادہ چادر لے آؤ۔" اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہ نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا، آپ نے نماز پڑھی تو خیالات میں کیسوی نہ رہی، آپ نے اس کو اتر وادیا۔

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں جن میں نسبتاً سکون میر ہوتا ہو اسی لیے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہیے تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے اس لیے ذرا توقف کا حکم دیا گیا، گرمی کے دنوں میں چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے اس لیے فرمایا کہ پھر کی گرمی (گویا) جنم کی آگ ہے اس لیے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو۔

فان الصلاة مشهودة وحضورہ کیونکہ نماز میں حضور ہوتا ہے۔

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے، گند چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو بہر حال تم کو دیکھ رہا ہے۔ کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے، ایک صحابی جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے پھکیاں بندھ گئی ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا پگلی چل رہی ہے یا لٹنڈی ابل رہی ہے۔

رات کی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب ذوق و شوق کا عالم طاری ہوتا تھا۔ قرآن پڑھتے چلے جاتے جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم و کرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ نماز دو رکعت کر کے ہے، اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے اور تضرع و ناری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی ہے اور سکت ہے اور ہتھ اٹھا کر اسے رب! اے رب! کہنا ہے، جنے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص ہے۔ ایک دفعہ آپ اعکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قراءت کر رہے تھے، آپ نے فرمایا لوگو! تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے، تو وہ مجھے کہہ دیا کہ وہ ہے اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو۔

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کچھ ہدایت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہیے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اسی وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو، کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے۔

صحیح مسلم باب کراہۃ الصلوٰۃ فی ثوب لما اعلامہ صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس صحیح مسلم باب النہی عن الماوقات الثلث صحیح بخاری کتاب الايمان صحیح ترمذی و ابوداؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ صحیح ابن ماجہ ج ۲ ص ۲۳۲ ابوداؤد باب الصلوٰۃ النار و ترمذی باب ما جاد فی التمشیح فی الصلوٰۃ ص ۱۱ مطبوعہ دہلی ابوداؤد و صلوٰۃ اللیل صحیح ابن ماجہ ج ۵ ص ۳۱۲ عن ابی ایوب

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لیکر اترتا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا موثر ذریعہ ہے، اسی لیے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَالَّذِينَ كَانُوا يُؤْمِنُونَ
بِهِ وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ حَافِظُونَ
(الانعام: ۱۱)

اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ
قرآن کو ماننے ہیں اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت
کرتے ہیں۔

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مقصود ہیں یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے | نماز تو دور حقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر تمدن ملک کو جس کو پہنچاؤ ٹھنڈے کا بھی سلیقہ نہ تھا چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کسی بیرونی تقسیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے تمدن ہو جاتا ہے۔ تمدن تو مسلمانوں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے، ان کو اخلاق کی وہ تقسیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا اب اکیر بن جاتا ہے۔

۱۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے، انسان کا، شرم و حیا کی نگہداشت کے لیے اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے۔ عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے، بلکہ شہرل کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لیے آتی تھیں تو اپنے کپڑے تار دیتی تھیں اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہاں تک کہ غیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں، آیت نازل ہوئی۔

خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف: ۳۱) ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

مردوں کے لیے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لیے پشیمانی سے لیکر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہمنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لیے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف تمدن قومیں زیب و زینت اور حسن و آرائش اور

تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آتی ہیں، مرد گھٹنوں سے اوپن لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان تمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی۔ چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے موماروک دیا ہے، اور کہہ دیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۲۔ اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے، اقراء کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا۔
وَمَا يَلْبُغُ فَطَهْرًا (مشر: ۱)
اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے اور نماز کی درستی کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن اور اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو۔ اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی مطلق تیز نہ تھی، یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی میں آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہؓ اس کو مارنے کو دوڑے، آپؐ نے ان کو روکا اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ: یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اس قسم کی نجاستوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہے۔ اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو، ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپؐ گزرے تو فرمایا کہ اس قبر والے پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا: غرض اس تسلیم نے جو صرف نماز کے لیے تھی، اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک صاف رہنے کا نگر بنایا۔ اور استنجا، بیت الخلاء اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی تمدن قومیں بھی نا آشنا ہیں۔

نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہؓ طہارت کا اہتمام کرتے تھے خدا نے ان کی مدح فرمائی:

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَّخِذُوا
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهِّرِينَ (توبہ: ۱۳)

صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے۔

۳۔ نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے، دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں، ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے

7 نختوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں۔

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو جالانگہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصولوں پر مبنی ہیں نمازیوں کو بخیر وقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے۔

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانستوں کو بہت کم صاف کرتے تھے، جس سے گندہ دہنی اور بدنامی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا۔

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہل عرب نہاتے کم تھے، ان کے کپڑے موم یا اون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رکھتے تھے اس لیے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی۔ اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جموعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

غسل يوم الجمعة واجب على كل

محتلمو (بخاری، کتاب الجمعة)

جو کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے۔

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا جس کے بغیر کوئی نماز مکمل ہی نہیں، فرمایا:-

وَأَنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا
اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔
(مائدہ: ۲۰)

۴۔ پابندی وقت | انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام اوقات مقررہ اوقات پر انجام پائیں۔ انسان فطرۃً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے اس کو پابند اوقات بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیے جائیں، جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں اس لیے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں خصوصاً نماز باجماعت کے، ان کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں۔ وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی کا مقولہ ہے۔

الصلاة مكیال فمن ادنی به ومن طفف فقد علمتم ما للمطففين . نماز ایک پیمانہ ہے جسے اس سے پورا ناپا اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے ناپے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے۔

۵۔ صبح نیزی | طب اور حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہیں، جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے جب تک رات کو وقت پر سو یا نہ جائے گا، صبح کو وقت پر اٹھ نہیں کھل سکتی، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نماز عشاء کے بعد بیکار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا ہے۔ تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر اٹھ نہ کھل سکے اور صبح نیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے اور صبح کو مؤذن کی نثر تاثیر آواز سے۔
الصلاة خیر من النوم ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھاوے۔
سونے سے نماز بہتر ہے۔

۶۔ خدا کا خوف | ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے تو رحت الہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جلتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کہ اس قسم کے افعال کام تکمیل ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں بدی کے راستے پر پڑتے وقت کا پتہ ہے، عرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے۔ اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے۔

ان الصلاة تنهى عن الفحشاء والمنكر
(مکتوبات: ۵)

۷۔ شکاری | نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیات الہی میں تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لیے دعائے معذرت کا نام ہے اسی لیے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم و احساس کو کھودیں نماز کی حقیقت کی منافی ہیں اسی لیے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوتی تھی اس کو پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا۔

لا تقربوا الصلاة وانتم سكارى حتى تعلموا ما تقولون (نساء: ۴۳)
نشر کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو۔

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو کم کر دیں، قطعاً پرہیز کرے گا۔

۱۔ کنز العمال منہج ۱۰۰۰۰ باب الصلاة ج ۳ ص ۲۰۰ بحوالہ مصنف عبدالرزاق: بحاری کتاب الصلاة باب ما یکرہ من السر بعد العشاء

۸۔ مسلمان کا امتیازی نشان | مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیازی ضرورت تھی۔ قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا، احکام میں جج ایک ایسی چیز ہے جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے اسکے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، غلامی کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ جو عرب مدت سے تمدن کا ایک لازمی جزو تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اسکی اصلاح کر دی، زکوٰۃ بھی کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی اس کے ساتھ یہ عرب کی فیا من طبیعت پر بھی گراں نہیں ہو سکتی تھی۔ فقراء کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا تھا کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھاپی لینے کا موقع باسانی حاصل ہو سکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونوں گروہوں میں حد فاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ میں مسستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا:
وَ اِذَا نَامُوا اَلَى الصَّلٰوةِ قَامُوا کَسَالًا
(نساء: ۲۱)
اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کس مندے کے ساتھ اٹھتے ہیں۔

نیز فرمایا:-
وَ اِنَّهَا لَکَبِیْرَةٌ اَلَا عَلٰی الْخَاشِعِیْنَ (بقرہ: ۵)
خضوع و خشوع والوں کے علاوہ نماز سب پر گراں ہے۔
خصوصاً عشاء اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-
لیس صلوة اثقل علی المنافقین من الفجر والعشاء
منافقین پر فجر و عشاء سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہے۔
حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب ہم (صحابہ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے، تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے:-

مدینہ میں آکر نماز میں قبلہ کی تبدیلی جہاں اور مصلحتوں سے تھی، وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے۔ مگر معظہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے، بیت المقدس کی طرف مڑ کر نا جائز نہیں سمجھتے تھے، مدینہ میں یہود آباد تھے جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لیے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے، اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ کے قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِی کُنْتَ عَلَیْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَنْقَلِبُ عَلٰی عَقْبِیْنِهٖ وَاِنْ کَانَتَ لَکَبِیْرَةٌ عَلٰی الَّذِیْنَ هَدٰی اللّٰهُ (بقرہ: ۱۴۴)
اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا لیکن اس لیے تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں ان سے الگ کر دیں جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے اور یہ قبلہ گراں ہوا لیکن ان پر حرج کو خدا نے راہ دکھائی۔

۱۔ بخاری کتاب الصلاة باب فضل صلوة العشاء فی الجماعة علی شرط الشیخین، ج ۱ ص ۲۱۱

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہے گی اسی لیے آپ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے۔

۹۔ باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے اس فرض کے انجام دینے کے لیے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے:-

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجیوشہ
اذا علوا الثنایا کبروا واذا هبطوا سبوا
فوضعت الصلوٰۃ علی ذلک (ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی
پر چڑھتا تھا تو کبیر اور جب نیچے اترتا تھا تو تسبیح کہتا تھا،
نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی۔

صف بندی، ایک انصر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوں کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صف جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اور ان کے توانے ٹل کو بیدار کرتی ہے۔ جاڑوں میں پانچ وقت وضو کرنا، نذر کے وقت و صوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہو و لہب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا و زاری کر لینا، صبح کو خواب سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری میں مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے میں پیدا کریں اور کام کی ضرورت کے وقت احساں فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھیں اور اس کے لیے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں، ہفتہ میں ایک دن نماز جمعہ کے لیے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پُر آرام سے پُر آرام وقت میں ممکن تھا مگر اس کے لیے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں اور نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دیکھا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلات وقت کے اتفاقات میں اس کے لیے کس قدر مہم ثابت ہوتی ہے۔

۱۰۔ تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق ہے لیکن اصلاح اخلاق کا سبب بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لیے آمادہ رہے، تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھتی ہے۔ روزہ، حج، زکوٰۃ اولاً تو ہر شخص پر فرض نہیں ہیں اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ فرض نفس کو تنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے۔ برخلاف ان کے نمازوں میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے، بجدہ، رکوع، قیام و قعود، جہر و خفاء، تسبیح و تہلیل، تکبیر و تشہد نے اس کے ارکان اعمال میں تنوع و امتیاز پیدا کر دیا ہے جن میں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے اور تہمتیں گھنٹہ میں چند گھنٹوں کے وقفے سے نفس انسانی کو ہتھیارا اور قلب نختہ کو بیدار کرتی ہے اس طرح نفس کو رات دن تنبہ ہوا کرتا ہے۔

۱۱۔ بخاری باب فضل استقبال القبلة

۱۱۔ الفت و محبت | نماز مسلمانوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہوگی، ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لیے ہر وقت تیار رہیں گے۔ قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

وَالْقَوْلُ وَالْقِيَامُ الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۗ اِنَّ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَقُوا
دِيْنََهُمْ وَكَانُوا شٰغِبًا (روم: ۳۰)

خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو اور مشرکوں میں
سے نہ بنو۔ ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں
پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتنے ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتنا بندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

۱۲۔ بخاری | بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور بخاری کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب امیر و مغرب سب ایک جگہ جمع ہوں گے اور امر اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی خیامی کو تحریک ہوگی ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔

ابتداءً اسلام میں اصحاب صفہ کا ایک گروہ تھا جو سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا، یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا، صحابہ نماز کو جلتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لیا کہ مسجد میں لٹکا دیتے تھے جس پر یہ گروہ گزارا وقت کرتا تھا۔ اکثر صحابہ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کے ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات و صدقات کا ذریعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ
يُنْفِقُونَ (بقرہ: ۱۱۰)

اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے
اس میں سے صرف کرتے ہیں۔

۱۳۔ اجتماعیت | اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے اس لیے تمام قوموں نے اس کے لیے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کیے ہیں جن قوموں کو مذہبی فیروزے آنا دکھا جاتا ہے ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبوں کانفرنسوں، آئیورسوں اور دوسرے ملے جلوسوں اور مظاہروں سے کی جاتی ہے لیکن یہ اجتماعیت جہاں فلسفے پہنچاتی ہے وہاں اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے۔ اجتماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہی رنگ رلیوں، رقص و سرود، شراب خواری، قمار بازی، چوری، بدنظری، بدکاری، رشک و حسد، بلکہ قتل غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں عرب مشرکوں میں بھی ملتی ہیں تھیں اور اب بھی ملتی ہیں، قبور پر ناجائز اجتماع، مغرض تمام اجتماعی برعات بدترین گناہوں اور نادوں کا مرکز بن جاتے ہیں اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لیے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس سے قلب

انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھاسکے اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کے بجائے نیکی کے رخ کی طرف بھے چنانچہ اسلام نے اسی لیے روزانہ جماعت کی عام نمازیں، ہفتہ میں جمعہ کی، اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو اور مشرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیاد ہی دعوت خیر پر رکھی گئی ہے۔ حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کیساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت کو قرار دیا اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال اور اخلاص عمل کی بنیاد پر قائم ہے۔

۱۴۔ کاموں کا تنوع | انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ سہم رنگی کے باوجود تفنن اور تجمد کا طالب ہے لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں تو سکون و اطمینان، عیش و راحت اور دلچسپی کی لذت جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفقود ہو جائے، مفید سے بھی مفید کام سے دنیا بیخ اٹھے، اسی لیے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مفید طریقے پر کی ہے جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیات الہی میں شمار کیا گیا ہے کہ اس تغیر و تبدل سے نظام عالم میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے اور اس تقسیم سے انسانوں میں اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو سہل نہ اور ہر لحظہ انسان پر فرض ہے اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پرا کر توڑ دیا۔ پھر مغربیت ہوئی اور ظہر پر پانچ گزتم ہوئی۔ پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا۔ بعد ازیں خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور شاپر جا کر ختمی ہوئی، اب نیند آگئی اور صبح تک بے خبری رہی، اٹھے تو دعاؤں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا۔ وہ دولت مند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے وہ اس روحانی انٹروال (دوقفہ) کے لطف سے آگاہ نہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو رہا جاتا ہے۔ وہ چند منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح، اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لیے نئی قوت پیدا کر لی۔

۱۵۔ تربیت | انسان کی عملی کامیابی استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے کہ جس کام کو اس نے شروع کیا پھر اس پر عمر بھر قائم رہے اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے جس کام میں اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو بلکہ دن میں کسی دفعہ ہو۔ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بارے سے عمدہ برا ہونے کے لیے انسان میں استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے اس لیے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی اسی لیے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح میں فرمایا:-
الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ أُمْنُونَ (معارج: ۱) وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

احب العمل الى الله اذومه وان قل محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو

(البراد و باب ما یؤمر بہ من القصد فی الصلوٰۃ) ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو۔

۱۶۔ نظم جماعت | کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گروہ جب کھلی جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا ناکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صفت بہ صفت کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانے سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا انکی فوری زندگی کی منظم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے جس طرح نماز کی درستی اس صفت اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب ملکر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہیں ملے۔

۱۷۔ مساوات | ایسی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درگاہ ہے یہاں امیر و عزیز، کالے گورے، رومی، حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے سب ایک ساتھ، ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، جماعت کی امامت کے لیے حسب و نسب، نسل، نژاد، رنگ، روپ، قومیت اور جنسیت، عمدہ اور مضرب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ علم و دانش، فضل و کمال اور تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں شاہ و گدا اور شریف و ذلیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر، ایک امام کے نیچے، ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے۔ کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درگاہ کہیں اور بھی قائم ہے۔

۱۸۔ اطاعت | جماعت کی سلامتی بغیر ایک مقرر من الطاعۃ امام کے ناممکن ہے جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرتے نماز باجماعت مسلمانوں کی اسی زندگی کا رمز ہے کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہیے جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کے لیے بانگِ درا اور صدائے حرس ثابت ہو۔

اطاعت امام کے لیے ایک طرف تو قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہیے، جس کی تعلیم مقتدیوں کو نماز میں ہوتی ہے۔ دوسری طرف امام کو اخلاق صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہیے جو ہمیشہ لوگوں کے پیش نظر رہے۔ نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک دائمی حرکت ہے جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گزار کی کے لیے تیار رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ نماز پنجگانہ اور جمعہ و عیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے۔ اس لیے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی، اس سے اثر پذیریری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزوں ہیں جو یک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں، ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش و عشرت میں مصروف ہو، نماز صبح میں شرمک نہیں ہو سکتا، ایک راحت طلب آدمی نظر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنو امیہ کا زمانہ آیا تو صحابہ کبار

لہ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ و بعد لہ البراد و کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف

خاص طور پر اس کا احساس ہوا اور بے خوف نگاہوں نے ان پر کتہ چنیاں کیں، احادیث میں بھی خاص طور پر اس زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے۔

۱۹۔ معیارِ فضیلت | نماز کی امامت کے لیے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقویٰ کے کوئی اور قیود نہیں ہے ایسے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ہر وقت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقرأ) ہے وہ امام بنے گا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لیے آئے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کس نہیں انھیں کو قرآن زیادہ یاد ہے، پنا پختہ آپ نے اسی کس صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا، اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویش و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے۔

۲۰۔ روزانہ کی مجلس عمومی | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آیا یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کر نیوالی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امر میں سے اطلاع پاتے یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل سے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا جس کیلئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کس کسوسی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے مذہبی و اجتماعی تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اولیٰ کی گھر کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گھر کھل گئی ہے، مسجد مسلمانوں کے قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعین کے لیے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے اسی طرح جب مسلمان زندہ تھے، ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا۔ ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی۔ ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دارالامارہ تھا، وہی دارالشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغہ جنگ کا دفتر تھا، وہی درس گاہ اور وہی مسجد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدہ کے لیے افراد اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور اختلاف باہمی کو تہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سر لشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انہیں رموز و اسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانوں کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری و فرمانبرداری اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے اسی لیے اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیاد امامت ہے نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے اسی بنا پر داعی اسلام علیہ السلام نے یہ فرمایا:-

العہد الذی بیننا و بینہم الصلوٰۃ ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے وہ نماز

فمن ترکھا فقد کفر راحد ترمذی، نسائی، ابن ماجہ ہے تو جس نے اس کو چھوڑا اس نے کفر کا کام کیا۔ کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالب بے جان، شراب بے نشا و گل بے رنگ و بو ہو کر رہ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی بناغت کا ایک ایک شکار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخت ہو جاتی ہے اسی لیے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

عرب کی روحانی کاپیٹل | وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب (کبیر منظر نہیں دیکھا تھا، وہ جس کی روح ربانی سے تسکین و تسلی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے دفعتاً کیا ہو گیا، اب عبادت الہی اس کے ہر کام کا مقصد بن گئی، اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی، اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی، اس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں باقی تھی۔ اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں اس کی روح یاد الہی کی تڑپ اور ذکر الہی کی بے قراری کے سوا کسی چیز سے تسلی نہ پاتی تھی۔

دل را کہ مردہ بود حیاتے ز نور سید ————— تابوئے از نسیم یئس در شام رفت
وہ عرب جن کی حالت یہ تھی کہ
وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا (نساء: ۳۱) اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔
دعوت حق اور فیض نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان نمایاں کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی ان کو ذکر الہی سے غافل نہ کر سکیں۔

رَجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔
عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (نور: ۵) اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے، غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لیے بیقراری تھی۔
يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ (آل عمران: ۲۰) جو خدا کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔
راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے غمار میں ہوتی، وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سجدہ راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے۔

تَجَافَى جُنُوبَهُمْ عَنْ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ جن کے پلو رات کو خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں،
رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا۔ وہ خوف اور امید کیساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔
وہ جن کا یہ حال تھا کہ

وَإِذْ أُنزِلَ لَهُمُ الرُّسُلُ الْوَالِيُونَ
(مرسلات: ۲۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے ہلکو
تو نہیں جھکتے۔

اب ان کی یہ صورت ہو گئی کہ
تَرَاهُمْ رُكْعًا سَجْدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا
مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا (نسخ: ۴)

تم انکو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے سجود میں پڑے
ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔

وَإِذْ أَدَّكَرُوا اللَّهَ وَحَدَّثَ إِشْمَارَاتُ قُلُوبِ
الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ (زمر: ۵)

اور جب تمنا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت
پر ایمان نہیں رکھتے، مکر رہ جاتے ہیں۔

الَّذِينَ إِذَا دُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ
(انفال: ۱، ج: ۵۰)

وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے
دل دہل جاتے ہیں۔

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی
روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ تمام لوگ بڑھاپے سے نواہ و خواہ
کھستی کرتے ہیں یا تجارت یا محنت مزدوری مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی
قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا
تھا تو یہ شغل و عمل ان کو یاد الہی سے غافل نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمر
کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی تکبیر ہوئی، دیکھا کہ صحابہ نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے۔
صحابہ تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے، یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں
بھی وہ عبادت الہی میں مصروف رہتے تھے۔ خدا نے گواہی دی۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَى
مِنَ النَّبْئِ الْبَيْتِ وَنِصْفَهُ وَنِصْفَهُ وَمَا ظَنَّهُ
مِنَ الَّذِينَ سَعَلُكَ (مزل: ۲)

بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب
اور آدھی رات اور تہائی رات کے بعد اٹھتے اور تیرے
ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔

اس زمانہ میں صحابہ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا جلوہ دیدار کے مشتاق دن بھر
کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے، ذوق و شوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین
پر رکھ دیتے تھے، دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس والہانہ انداز
عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے، قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ الَّذِي
يَرُدُّكُمْ حِينَ تَسْأَلُونَ لَوْ تَقَلَّبْتُمْ
فِي السَّجْدِ بَيْنَ (شعراء: ۱۱)

اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات کو
جب تو نماز کے لیے اٹھتے اور سجدہ میں پڑے
رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے۔
مدینہ منورہ میں اگر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسِ اطْعَمُوا الطَّعَامَ وَافْتَشُوا
السَّلَامَ وَصَلُوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسِ نِيَامَ (ترمذی)

اے لوگو! مغز بھریں کو کھانا کھاؤ اور اسلام کو پھیلاؤ
اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہیں۔

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انہوں نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا آخر آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کو ان لوگوں کو اعتدال اور میاں زدوی کا حکم دینا پڑا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رات بھر نماز میں مصروف
رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ عثمان! تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، نماز بھی پڑھو
اور سوؤ بھی، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صحابہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ ابو ہریرہؓ
نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے ایک میں خود نماز پڑھتے تھے، دوسرے میں ان کی بیوی اور تیسرے میں ان کا
غلام اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ساری رات نماز پڑھ کر سوتے تھے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی۔ حضرت ابو ذرؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ
رات رات بھر نماز میں گزار دیتے تھے، حضرت سلمان فارسی ان کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ ان کے
ہاں جا کر مہمان ہوئے۔ جب رات کو حضرت ابو ذرؓ عبادت کے لیے اٹھنے لگے تو حضرت سلمان نے منع کیا پچھلے
پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سلمان نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے۔ کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام
لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز قضا کی تھی، یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس
فرض سے غافل نہیں رہتے تھے، ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پُر خطر کام کے لیے کہیں
بھیجا تھا، جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر
پڑھے گا اہتمام کیا جائیگا تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الہی کی تعمیل میں دیر ہو
جائے گی۔ اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلے جاتے
تھے۔ سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں
وہ دوسروں کا سہارا لیکر مسجد میں حاضر ہوتے تھے پھر وہ جس خضوع و خشوع، محویت اور استغراق کے ساتھ
نماز ادا کرتے تھے اس کا نظارہ بڑا پُر اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس
شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک بھی اس کا اثر ہوتا تھا، حضرت عمرؓ نماز میں اس زور

لہ ابو داؤد باب القصد فی الصلوة لہ ابو داؤد کتاب الصلوة فی وقت قیام النبی من ایل تہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ
باب الخشع لہ صحیح بخاری کتاب الصوم لہ ایضاً لہ ابو داؤد باب الصلوة الطالب لہ نسائی کتاب الامم باب المحافظة
علی الصلوة لہ صحیح بخاری کتاب الصلوة باب اذا بکی الامام فی الصلوة

سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صفت تک جاتی تھی۔ حضرت تیم داری ایک رات تہجد کے لیے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی، بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے۔ شب شود صبح وہاں محو تاشا باشم

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ستون کھڑا ہے اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جاہد سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آکر بیٹھ جاتے تھے۔

ایک رات میدان جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لیے متعین ہوتے ہیں، ایک صاحب سو جاتے ہیں اور دوسرے نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہوتا ہے، کپڑے خون سے تر ہوتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے، نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں، ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا۔ جواب ملتا ہے میں نے ایک پیاری سورۃ شروع کی تھی، پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کیے بغیر نماز توڑ دوں۔

اس سے بھی زیادہ پُر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تیروں اور تلواروں کی جلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں، سروگردن، دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعتاً نماز کا وقت آجاتا ہے، فوراً جنگ کی صفیں، نماز کی صفیں بن جاتی ہیں اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پروا ہو کر گرنے لگتی ہیں اور اٹھنے لگتی ہیں۔

نور کا ترکا ہے اسلام کے دائرہ کار مرکز، فاروق اعظمؓ امام نماز میں، پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں۔ دفعتاً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر حکم مبارک کو چاک کر دیتا ہے، آپؐ غش کھا کر گر پڑتے ہیں خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے، سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں، پہلے صبح کا دو گنا ادا ہو لیتا ہے تب خلیفہ وقت کو اٹھایا جاتا ہے۔

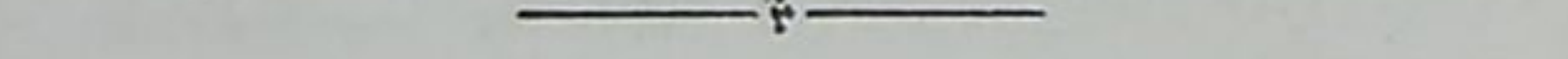
حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا، اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لیے جگایا تو بولے ہاں! جو شخص نماز چھوڑ دے، اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی۔

۱۔ صحیح بخاری کتاب الحجۃ و کتاب الصلوٰۃ، باب المسجد کیون فی الطریق لہ اسد الغابۃ تذکرہ حضرت تیم داریؓ صحیح بخاری باب الملک بن السجستانیؓ حالات عبداللہ بن زبیرؓ صحابہ و اسد الغابہ وغیرہ ابو داؤد و کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم لہ صحیح بخاری واقو شہادت عمرؓ مؤطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب العمل فین غلب علیہ الدم

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتے ہیں یا صبح کی نماز میں ہڑتے ہیں کہ ابن طلحہ کی تلوار ان کو گھائل کر دیتی ہے اور کچھ دیر کے بعد وہ داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ امام مظلوم حسین بن علیؓ کے بلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدان جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں، ہزاروں اشقیاء آپ کو نرغہ میں لے ہوتے ہیں، اتنے میں ظہر کا وقت آجاتا ہے، آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔

نماز میں جس خصوع و خشوع کا حکم ہے، صحابہ کرام نے اس کے یہ نمونے پیش کیے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق و شوق میں خلل انداز ہوئی تو انہوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا۔ حضرت ابو طلحہ انصاریؓ اپنے باغ میں نماز پڑ رہے تھے ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آکر چھانا شروع کیا۔ حضرت ابو طلحہ دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی۔ دل میں کہا اس باغ نے فتنہ برپا کیا، یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یہ باغ راہِ خدا میں نذر ہے۔

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے۔ باغ اس وقت نہایت سرسبز و شاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا، پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی جب اس کا خیال آیا تو دل میں ناوم ہونے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا، راہِ خدا میں دیتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ انہیں کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔



۱۔ الریاض النضرۃ لمحب الطبریؓ تاریخ طبری کبیر ص ۳۴۷ ج ۷ واقعات سترہ لہ یہ دونوں واقعات مؤطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب ما یشتغلک عنہا میں مذکور ہیں

زکوٰۃ

وَآتُوا الزَّكَاةَ

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم | نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق و مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان بھداری اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لیے مالی سرکاری باہم پہنچانے زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے، جس کا اطلاق تعیم کیساتھ ہر ملی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے لیکن فقہی اصطلاح میں زکوٰۃ صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے، جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو۔

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں | زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن ان کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزو لاینفک ہے، اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا ایسے نماز اور زکوٰۃ دونوں میں

أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ (بقرہ: ۱۱۰) ہم نے بنی اسرائیل سے قرار لیا تھا کہ کھڑی رکھو نماز اور دے دو زکوٰۃ
لَبْنُ أَفْتَمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ (مانہ: ۲) (اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ۔
حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے ذکر میں ہے :-

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكُتُبِ أَسْمِعِلْ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (مریم: ۴۰)
حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کہتے ہیں :-

وَإِذْ صَافَى بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم: ۲۰)
اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر سنا پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔

توراة سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (اجبار - ۲۲۰، ۳۰۱، ۲۴) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال نیا واجب (خروج: ۳۰۰ - ۱۵۰، ۱۳) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج، کھلیان کی منتشر بالیں اور پھیل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی، یہ قسم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی، اس کا ساٹھواں حصہ مذہبی ۶۔۶ دار پاتے تھے، دسواں حصہ حضرت ہارون

کی اولاد (لازمین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی اور ہر تیس سال میں دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کیلئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیوقوفوں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم، جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لیے رہتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی، بلکہ انہی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا انجیل لوقا (۱۸: ۱۰-۱۱) میں ہے کہ جو اپنا عشر (زکوٰۃ) دیا، نمائش، اور فخر کے لیے دیتا ہے، اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے۔ اسی انجیل کے ۲۱ ویں باب کی پہلی آیت میں ہے۔

اگر کوئی دولت مند سبیل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے، اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ غلوس دل سے نو مٹری ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولت مند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹا دے۔

کراونٹ کا سوئی کے نلکے سے گزر جانا آسان ہے مگر دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ (متی ۱۹)
ساتھ ہی انہوں نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے (متی ۲۳)
توراة کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی، اس لیے ان ہی دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے، سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی اس لیے انکی زکوٰۃ کا ذکر ایک دو جگہ ہے اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی، علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے، تصریحاً معلوم نہیں ہوتی، نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے، یعنی وہ کہاں خرچ کی جائے اس کی تفصیل بھی خود توراة کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے۔

غرض وجوہ جو کچھ ہوں، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا، اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ
وَاقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ ۝
(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) کہ نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا، پھر تم پھر گئے، مگر تم میں سے کھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔ (بقرہ: ۱۰)

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا، دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کر نیکی احکام موجود تھے تاہم ان کے لیے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہر شخص پر قانوناً رقم واجب الادا تھی، جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل | محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیل کا نام انجام دیا اس نے نہایت خوبی اور دقت نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا، انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے اس لیے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار

دیا، ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے، سونا، چاندی اور جھانور پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ شرحیں مقرر کیں، سونے چاندی میں چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ معین کیا، جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مفاد کی تعیین و تحدید کی، اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ نواجہاں تھا، اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کر رہے۔ اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت | اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوق الہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں سے، ان دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی کیا لحاظ رکھا گیا ہے، قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر اقام الصلوٰۃ کے بعد ہی "اتوا الزکوٰۃ" آیا ہے مثلاً "اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ یا اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے اس سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے۔ بارگاہ نبویؐ میں اگر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کیے ہیں تو ہم نے آپؐ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے، صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائط بیعت میں داخل کی گئی ہے، چنانچہ حضرت جریر بن عبد اللہ بجلي کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تین باتوں پر کی تھی، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا وفد عبد القیس نے شہدہ میں نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپؐ نے اعمال میں پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو جگہ دی۔

لہذا کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو اسلام کا داعی بنا کر مین بھیجا ہے، تو اسلام کے مذہبی فریضوں کی یہ ترتیب بتانی کہ پہلے انکو توحید کی دعوت دینا، جب وہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ادا کرنی ہے، جب وہ نماز پڑھ لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے دولت مندوں سے لیکر ان کے غریبوں کو دینا ہے۔

صحابہ میں جو لوگ شریعت کے رازدان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابو بکر نے ان کے خلاف تلوار کھینچی حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے، حضرت ابو بکر نے جواب دیا خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کو لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ خدا کی قسم! جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اسکو دینا پڑے گا۔ حقیقت میں

لہ یہ دونوں حدیثیں صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸ میں ہیں صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۶ کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸

یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا۔ اس نے کجا اور امانت کو بچایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی تنظیمی زندگی ضرور بنیاد پر قائم ہے، جن میں ایک روحانی نماز باجماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو قائم ہوتا ہے اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہوتا ہے ایسے دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں اور انکی انفرادی حیثیت کیساتھ انکی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدی نے خاص زور دیا ہے۔ نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد دور ہو جاتی ہے اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے، مگر اسکی فرضیت کے بعض مقاصد فوت ہو جاتے ہیں یہی سبب کہ حضرت ابو بکر کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے بلکہ بطور خود اسکو ضرر کریں گے، تو شریعت محمدی کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بنو رانکو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا، اگر انکی یہ بات تسلیم کر لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سررشتہ اسی وقت پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امانت و جماعت کا نظام اسی وقت زخم برہم ہو جاتا۔ انفرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دستگیری، مسافروں کی امداد و تمیہ کی خبر گیری بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل | جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ اگر رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی، اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتداء میں شروع ہوئی لیکن اسکا پورا نظام آہستہ آہستہ جمع کر کے بعد قائم ہوا، بعض موزوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ شہدہ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اس پر شبانی ہوئی ہے، حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مترادف تھا اس کی مقدار، زمانہ، سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالت کے بدلنے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظوں کے مرکب خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا منظر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے اسی طرح بیکس لاجار انسانوں کی دستگیری زکوٰۃ، بھی فرمایا کرتے تھے، حضرت خدیجہ الکبریٰ نے بعثت کے وقت آپؐ کی نسبت فرمایا، آپؐ قرابتداروں کا حق پورا کرتے ہیں، قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں غریب کو کھواتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں، لوگوں کی مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں، غور کرو کیا زکوٰۃ ان ہی فریضوں کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہیں اور ان ہی دو اجالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے۔

لہ درحقیقت حضرت ابو بکر صدیق کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی فاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ..... فَإِنْ مَاتُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ (توبہ: ۱۰) ان مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ..... تو اگر وہ توبہ کریں اور نماز پڑھیں کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کو آزادی دیدو، و نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۶ باب کبریۃ الاختلاف لہ صحیح بخاری جلد اول باب اول:

سورہ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورت ہے لیکن اس سر زمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا، ایمیں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے۔

وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ (مدثر: ۱) اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر۔

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا۟ سُبُّهُ سُبُّ اللَّهِ (مدثر: ۱) اور بدلہ بہت چاہنے کے لیے کسی پر احسان نہ کر۔

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، مدثر کے بعد سورہ مزمل اتری، اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْزَكٰوةُ وَاَقْرَبُوْا لِلّٰهِ (اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرص دو)

قَرْضًا حَسَنًا وَاذْكُرُوْا اللّٰهَ الَّذِيْ لَكُمْ مِّنْ خَيْرٍ (اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس

تجدوہ عند اللہ ہو خیراً وَاكْبَرُ الْجَزَاءُ لِمَنْ اٰمَنَ) بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے۔

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہیں اور نجاشی نسل نے وہاں میں باکران سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں اور حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے، ایں ہے:

پہنچے ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روز رکھیں، اور زکوٰۃ دیں، اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہو چکا تھا اور وفد عبدالقیس کے (جو تقریباً ۶۱۰ء میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی۔

۶۱۰ء میں جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے، اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ و صدقہ کا بھی تذکرہ کیا، ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۶۱۰ء سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا، بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کار بند بنانا تھا، ایسے حالات کے اقتدار اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلق احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچانی گئی، مکہ معظمہ میں مسلمانوں کی پریشانی، پرالگندی، شکستہ حالی اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی اسکی بنا پر زناہی انکے لیے بہت تھا کہ وہ کسی قریم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دیں چنانچہ اس بناء میں اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی۔

وَمَا اٰذْرٰكَ مَا الْعُقْبَةُ فَكَتَّرْتَهُ (اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھائی کیا ہے، کسی رقم ضلہ یا قیدی

اَوْ اطْعَامٍ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْجِنٍ یُّبٰیئُهَا (یا غلام) کی گردن پھرانایا بھوک کے دن میں ملتے کے کسی بن

ذَامَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنَا اِذَا مَرْتَبَةٌ (بلد) ۱) باپ کے بچہ کو، یا خاک میں بڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا۔

عام قریش پر جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہیں سنا عتاب آیا:

فَذَلِكِ الَّذِي يَدْعُ الْيَتٰمٰیْمَ وَلَا يَحْضُرُ (وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب

عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنَ) (الماعون: ۱) کے کھلانے پر اپنے کو آمادہ نہیں کرتا

یہ بات نہیں بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور آپس میں محتاج کو کھلانے کی تاکید نہیں کرتے

عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنَ (الفجر: ۱)

اور مسلمانوں کے اخلاص، باہمی ہمدردی اور ان کے جذبہ ترحم کی تعریف فرمائی کہ:

وَيُطْعَمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهِمْ مِّسْكِيْنَا وَيَتِيْمًا (اور وہ رحابتمند ہونے کے باوجود محتاج، یتیم، اور

قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو صرف خدا کیلئے کھلاتے ہیں، تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

مِنْكُمْ جَزَاءٌ وَّلَا تُشْكُرُوْا) (دہر: ۱)

مدینہ منورہ آ کر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے کچھ پانا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ستمہ میں صدقہ الفطر واجب ہوا یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرے تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گزاریں، اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی انہوں نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! ہم کیا خیرات کریں۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ (بقرہ: ۲۴)

وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں ارشاد ہوا:-

قُلِ الْعَفْوَ (بقرہ: ۲۴۱) کہ دو راے مجھے، کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بیچ رہے (اسکو خیرت کرو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جسکا مطلب ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کریں امداد کے لیے کچھ بچا کر رکھیں کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ (اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم نے

مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ) (بقرہ: ۲۴) تمہارے لیے زمین سے پیدا کریں انہیں کچھ خیرات میں دو۔

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (بقرہ: ۱)

اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے انہیں سے وہ کچھ خیرات کرتے ہیں۔

صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا، خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بے قرار رہتے تھے چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے تو غریب و نادار صحابہ نے اگر عرض کی کہ خدا کے رسول! جبکہ پاس نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھانے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے، انہوں نے پھر گزارش کی کہ جس میں اسکی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا کہ وہ فریاد خواہ حاجتمند کی مدد کرے، انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو، ارشاد ہوا، تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے، یہی اس کا

یہ دستور ہو، ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کوراج کیا تھا، مگر چونکہ اسلام کو محکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مد نظر تھی، اس لیے اُس نے چار کو پانچ کر دیا، اس طرح چوتھ (۴) کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا، جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے نائب اپنے ذاتی ضروریات، اہل و عیال کے نان و نفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مدد میں صرف کر سکیں۔

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے "غنم" ہے، قرآن پاک نے کہا:

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ رَبَّهُ خُسَّةٌ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ (انفال: ۵)

اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ خدا کے لیے اور رسول کے لیے اور قربت مند کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے۔

نکتہ، اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلیٰ کلمۃ اللہ ہے، غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں اور اگر کوئی صرف حصول غنیمت کی نیت سے لڑے تو اسکی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی، اور نہ اسکا کوئی ثواب ملیگا، اسکی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرمادی ہے، اس بنا پر درحقیقت وہ مال غنیمت جو لڑائی میں حاصل سے لاکھ آتا ہے، ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً لاکھ آئے اس میں پانچواں حصہ نظام جماعت کا ہے، یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لیے ہے۔

یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے، اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے، تاکہ وہ جماعت کے مشترک مقاصد کے صرف میں آئے، وہی ہے جس کی بنا پر زکوٰۃ یعنی دینہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غنیمت سے لاکھ آجائے، "غنم" یعنی پانچواں حصہ، جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے، توراہ نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا، شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ سمجھی کے ساتھ، پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی، سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں، تاکہ اُن سے حسب مشا و خانگی اور تجارتی فائدہ اُٹھایا جاسکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں، کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں مثلاً آلات، مکان، لباس، مسلمان، اسباب، سوار، تیرتی پتھر ان پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی، کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشوونما پانے والی چیزیں چار ہیں، زمین، جانور، سونا چاندی یا اُن کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔

زمین کی دو قسمیں کی گئیں، ایک وہ جس کے جوڑے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچہ لگاؤ کا شکار کرتا ہے، مگر

لے قیمتی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتی وغیرہ ہیں، ان پر اس لیے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسباب زمینت قرار دیا ہے، فرمایا: حَلِيكَةٌ تَلْبَسُوْنَهَا (مخل و فاطر) زمینت جن کو تم پہنتے ہو (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

موتی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاق دولت سے آدمی زکوٰۃ یعنی عشر (۱۰) مقرر کیا گیا، زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو مثلاً کنوئیں سے پانی نکال کر لانا، یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس میں قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسواں حصہ (۲۰) مقرر ہوا ہے سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی محنت محنت کرنی پڑتی ہے اور جسکی افزائش کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری کا بھی اوصاف، یعنی چالیسواں (۲۰) حصہ مقرر ہوا (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے)

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی و بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اسکا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوتی ہے، اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں، لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی ضرورت ہے وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ وہ اس کو حاصل کرتے ہیں، وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہیں، جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، پھر وہ اس پیداوار کو لیکر گاؤں گاؤں شہر شہر اور ملک بنگلہ پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے، سونا چاندی حدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی

حاشیہ: یہ ایسے ہی ہیں جیسے بعض فقہاء کے نزدیک سونے چاندی کے استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کہ یہ بھی ان کے نزدیک اسباب زمینت میں ہیں ماب اگر کوئی شخص ہزاروں اور لاکھوں روپے کے جواہرات جمع کر لے تو اس کی عین صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو تجارت کے لیے ہیں، تو ان پر مال تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی، دوسری یہ کہ کوئی بد نصیب زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کر لے، تو گو قانوناً اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی لیکن دینا نہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت گنہگار ہوگا، اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ محض سامان تفریح اور فخر و مباہات کے لیے جمع کرتا ہے، تو اس کی حالت وہی ہوگی جو پیش قیمت ہاسوں اور سامانوں کا ذخیرہ جمع کر لے، اس کا شمار اسراف میں ہوگا اور اس پر وعید ہے۔

اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت کی گرائی نقدین (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے بلکہ محض فرضی ہے، نہ وہ خود ضروریات زندگی میں ہیں، نہ ان سے ضروریات زندگی کا مبادلہ یا حسد بیاری معمولاً کی جاتی ہے، چند دولت مندوں کی طلب اور مانگ نے ان کی فرضی قیمت بنا رکھی ہے، اگر ان جواہرات کی آب جاتی رہی، یا وہ لوٹ جائیں، یا ان میں بال پڑ جائے تو ان کی قیمت فوراً گر جائے گی، بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کی قیمت کی گرائی طبعی اسباب سے ہے، اور وہ ضروریات زندگی کے لیے مبادلہ ہے وہ بھی ٹوٹ جانے یا میل بھی ہو جائے تو بھی اس کی قیمت ہر حال میں باقی ہے، اسی لیے وہ میاں زر ہیں۔

حاشیہ صفحہ ۱۱۷: یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں بیان کیا ہے:

کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دور ہوتے ہیں، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکنوں سے بھی محروم رہتے ہیں، اس لیے نسبتاً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات، اور مستحقین کی امداد میں اس اتفاق یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کرتے ہیں اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لیے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے۔

زکوٰۃ کی شرح مقدار کی تعیین میں اس شخص والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ خمس میں چونکہ ماہ حکومت کے تمام ذاتی و قومی مصارف شامل ہیں، اس لیے وہ کل کا خمس یعنی (۱/۵) مقرر ہوا اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورہ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں صرف آٹھ مصارف کی شرح مقدار ۱/۵ کا حصہ یعنی (۱/۶) مقرر ہوا یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ میں ان آٹھ مصارف کے لیے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰ درم یا اس کے ماثل سونا ہے، ان دو سو درموں کو پانچ پر تقسیم کر دیجئے تو چالیس ہو جائے گا، یہ کل زکوٰۃ کی شرحیں ۱/۵، ۱/۶، ۱/۷، ۱/۸، ۱/۹، ۱/۱۰ دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں، اس سے یہ اندازہ ہو گا کہ یہ تقسیم و تحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

جانوروں پر زکوٰۃ | توراہ میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوٰۃ کا تھا، لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانہ حمل) یکساں نہیں ہوتی، نیز جانوروں میں دسویں بیوی کا حصہ مشاع ہر تعداد پر چسپاں نہیں ہو سکتا اس لیے ان میں دسویں بیوی کے بجائے تعداد کے تعیین کی ضرورت تھی، شریعت محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا، چنانچہ اسی پہلے اصول (سپیدائش اور افزائش کی مدت، کیفیت اور کمیت) کی بنا پر اولاد بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا، مثلاً خچر گھوڑے (یا ہندوستان میں ہاتھی) پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت و کیفیت افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح متعین ہوئی۔ یہ وہ شرح نامہ ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمت ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا اور ربانی نہیں، بلکہ فریضہ کی صورت میں، لکھو اگر مثال کو عنایت فرمایا تھا، اور خلفائے راشدین نے اسی کی نقلیں حدود حکومت میں بھجوائیں اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	۱ سے ۳ تک	کچھ نہیں	اونٹ	۲۰ سے ۳۰ تک	چار بکریاں
"	۴ سے ۵ تک	ایک بکری	"	۲۵ سے ۳۵	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
"	۱۰ سے ۱۳ تک	دو بکری	"	۳۵ سے ۴۵	اونٹ کا دو سالہ بچہ
"	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریاں	"	۴۵ سے ۶۰	اونٹ کا تین سالہ بچہ

لہ اجارہ ۲۰-۳۰ حصہ حنیفہ کے نزدیک خیل مناسلا اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوٰۃ ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑوں میں نہیں ہے

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	۶۱ سے ۷۰ تک	چار سال کا اونٹ کا بچہ	بکری	۲۰۰ سے	تین بکریاں
"	۷۱ سے ۹۰ تک	دو سال کے دو بچے	"	۳۰۰ تک	بھینس
"	۹۱ سے ۱۲۰ تک	تین سال کے دو بچے	پھر ہر سو پر	"	ایک ایک بکری
"	۱۲۰ کے بعد ہر	دو سال کا ایک بچہ	گلٹے بیل	ایک سے	کچھ نہیں
"	چالیس سے	تین سال کا ایک بچہ	بھینس	۲۹ تک	"
بکری	۳۱ سے ۴۰ تک	کچھ نہیں	"	۳۰	ایک دو سالہ بچہ
"	۴۱ سے ۵۰ تک	ایک بکری	"	۴۰	تین سال کا بچہ
"	۵۱ سے ۶۰ تک	دو بکریاں	"	۶۰	۲ سال کے دو بچے

نصاب مال کی تعیین | شرح زکوٰۃ کے تعیین کے سلسلہ میں شرایع سابقہ میں ایک اور کمی تھی جس کی تعمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے کر دی، جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعیین ہے ان میں غریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی مثلاً اگر رس بیس روپے والوں، یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کی جاتی، تو ان پر ظلم ہوتا، توراہ میں غلہ اور رویشی پر جو عشر اور نقد پر جو آدھا مشاقل مقرر کیا گیا ہے، اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے بلکہ آدھے مشاقل کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ "خداوند کے لیے نذر کرتے وقت آدھے مشاقل سے امیر زیادہ نذر سے اور غریب کم نذر سے" (خریج، ۳۰-۳۱) لیکن شریعت محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا اور غریبوں، ناداروں، مقروصوں اور ان غلاموں کو جو ہرگز نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لیے سرمایہ جمع کر رہے ہیں اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ کو وہی آدھا مشاقل رکھا، لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مشاقل اسی لیے لیا جائیگا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مشاقل سونے کا مالک ہو، اور ۱۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مشاقل سونے کی متوسط قیمت دو سو درہم پانڈی کے سکتے ہیں یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے وہ کم سے کم معیار دولت جن زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے،

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
غلہ اور پھل	پانچ دس سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
اونٹ	پانچ عدد
گائے، بیل، بھینس	۳۰ عدد

لے موجودہ انگریزی حساب سے بیس مشاقل سونا سات تولہ کے، اور دو سو درہم پانڈی ۵۲ روپے کے برابر ہے سنی ابوالاد کتاب الزکوٰۃ باب من یصلی الزکوٰۃ وعد الغنی جلد اول ص ۱۶۳، اصح المطابع کعبیہ کے ایک دست وہ ہوجے جس کو عادتاً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو

بھڑ بھڑی، سونا چاندی	۳۰ عدد سے کم پر زکوٰۃ نہیں پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں، ۲۰۰ درہم سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
----------------------------	--

اس معیار سے امیر و غریب کی سطوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی نامہ سواری تھی وہ دور پھوٹی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہو گئے،

ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد، جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گونا گونہ ہے، مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں، پانچ وسق غلہ، دو سو درہم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا، درحقیقت ایک ہی معیار ہے، ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درہم کے برابر ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دو سو درہم برابر ہیں، اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس درہم، یا ۴ مثقال تھی، یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دو سو درہم یا بیس مثقال ہوتی،

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات | حضرت موسیٰ کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدمی کے مثقال سونے چاندی کی، یہ رقم جماعت کے خیر یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طوائف و تقریظوں کے سامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی (خروج ۳۰-۱۳)، دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جا بجا کونوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیے جائیں، وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا، ارجار ۱۹-۱۰ اور سوم یہ تھی کہ ہر تیس سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل ذیال کے بیت المقدس جا کر جشن منانے اور کھانے اور کھلانے، اور لادلوں میں جو موردنی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گزار ہیں، نام بنام تقسیم کیا جائے اس کے بدلے میں وہ خاندانی ذرائع سے محروم رکھے گئے تھے، اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں، کہ ان سے مسافروں، یتیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے (استثناء ۱۳-۲۶-۲۹ تک)

شریعت محمدی نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصطلاح کی،

۱- وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا، یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے، اس بنا پر مفت خور کاہنوں اور عبادت گاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہو گئی اور اس لیے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا، کلیتہً اڑ گیا۔

۲- عبادت میں سادگی پیدا کر کے ظاہری رسموں اور نمائشوں سے اس کو پاک کر دیا گیا، اس لیے جو چاندی کے سامانوں، قربانی کے برتنوں، اور محرابوں کے طوائف شمعدانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

۳- حج اُن ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زادراہ ہو، اس لیے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی اور اس لیے یہ رقم بھی خارج ہو گئی۔

۴- زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی، کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات میں خرچ ہو گئی تو اس میں ایشیا رکھا ہوا،

لہ ہذا جلد اول، باب الزکوٰۃ فی التجارة

۵- اس طرح وہ تمام سامان اور زمینیں جو ان مدوں سے بچیں، غریبوں، مسکینوں اور مسافروں کو دیدی گئیں گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدی نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں، مثلاً

۶- شریعت سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی، بلکہ ذخیرہ میں جمع ہو کر اس کا کھانا پک کر غریبوں میں تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضروریات میں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں، اس لیے شریعت محمدی نے اس رقم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دیدی جائے تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں خرچ کریں۔

۷- ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدمی سے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کے لیے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی، شریعت محمدی نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرم کر کے اس کو بھی تمام تر مستحقین کے ہاتھوں میں دیدیا۔

۸- غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا اور وہیں سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا، یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لیے تو شاید موزوں ہو سکتا، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منتر پیروں کے لیے یہ بالکل ناممکن تھا، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی نام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

۹- بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے، جب تک ان کو آمد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو طعن و طنز کرنے لگتے، اسلام نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادت بد کی اصلاح کے لیے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کر دی اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں، اور اس رقم سے کس کس کو مدد دیا جاسکتی ہے چنانچہ سورہ توبہ کے ساتویں رکوع میں اس کا مفصل ذکر ہے،

۱۰- اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کی جاتی اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتا دیے جاتے، تو یہ تمام طریقے خلفاء اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی ان کے پیش رو شہرت کے پُر تکلف سامانوں کے نذر ہو جاتا، اس لیے تاکید کر دی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لے گا، اس کے لیے یہ حرام ہے اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دینا لے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔

۱۱- اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروؤں پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لیے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، حضرت موسیٰ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارون اور ان کی اولاد بنو لادی، کو ٹھہرایا گیا تھا، کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، اور اپنے خاندان کے لیے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مدد قطعاً طور پر حرام قرار دی۔

۱۲- قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے۔
 إِنَّمَا السَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ الْمَسْكِينِ وَ
 الْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلَىٰ وَ
 زکوٰۃ کا مال تو غریبوں، مسکینوں، اور زکوٰۃ۔
 مصلحہ میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کے لیے

وَفِي الرَّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأَبْنِ السَّبِيلِ هُرَيْصَةَ بِنِ اللَّهِ وَاللَّهُطَ وَاللَّهُ عَيْبُو حَكِيمُو. (توبہ: ۸)

ہے جنکے دلوں کو اسلام کی طرف ملانا ہے اور گردن پھرانے میں جو تاؤ ان بھریں ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر کے بارے میں خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے، اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے اس لیے اس کی یہ تقسیم علم و حکمت پر مبنی ہے،

فقراء میں ان خود دار اور مستور الحال شرفاء کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری یا چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں چنانچہ فرمایا:-

لِلْفَقْرِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يُسْتَطِيعُونَ ضَرْفًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعْفُفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيَاهِهِمْ لَا يُسْأَلُونَ النَّاسَ الْحَافَا (بقرہ: ۲۴۰)

ان مفلسوں کو دنیا ہے جو اللہ کی راہ میں ایک ہے ہیں اور زمین میں (موزنی حاصل کرنے کیلئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف انکے زمانے کی وجہ انکو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم انکو ان کے چہرے سے پہچانتے ہو، کہ وہ حاجت مند ہیں، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے،

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ ان کی اہمیت اور اپنے تعلق کے لحاظ سے نیا چاہیے چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا:-

وَأَنِّي أَنزَلْتُ عَلَىٰ حَبِيبِهِ ذُورِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرَّقَابِ ط (بقرہ: ۲۳۰)

اور جس نے خدا کی محبت پر ایمان کی محبت کے جذبوں قربت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں یا مقروضوں کی گردن پھرانے میں مال دیا۔ اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے:-

قُلْ مَا أَلْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِللَّهِ وَاللَّذِينَ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ (بقرہ: ۲۶۹)

کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے مال باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، اور مسافروں کے لیے،

ضرورت مندوں میں ترجیح اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قربت مندوں اور رشتہ داروں کے دینے سے اجنبی بیگانہ اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگوں کے دینے میں کچھ ذمہ نفاہیت کا اور ایک حیثیت سے خود غرضی کا شائبہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں اور ان کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا، ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں وہ تمام تر تعلقات کی کمی و بیشی پر مبنی ہیں، جو جتنا ہی قریب ہے اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اُس پر اور اُس کے حقوق آپ پر ہیں، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قربت مندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائیں، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے، پھر اہل و عیال کا، اُن کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال میں کچھ بچ جائے، تو اس میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قربت مند ہیں، چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم میں اسی اصول کی رعایت کی گئی ہے،

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قربت مندوں کو ترجیح دی جائے، تو دوسرے غریبوں کا حق کون ادا کریگا، ایک قسم کا مغالطہ ہے دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں کی خبر گیری کرے تو کل انسانوں کی خبر گیری ہو جائے گی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جسکو دور ہو جانا چاہیے، مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے اس کا مدار دو چیزوں پر ہے ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب و بعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کی حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی و بیشی، قربت مندوں کو ترجیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو، اُن کو اُن لوگوں پر ترجیح ہے، جن کی ضرورت اور حاجت مندی ان سے کہیں زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے، کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجت مند ہوں اور ان میں سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا، یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی و بیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی، نہ کہ پہلا سبب؛ اور یہ انسان کی فطرت ہے، کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے،

فقراء اور مسکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ در بند بھیک مانگتے پھرتے ہیں یا نکو ترجیح دیکھی ہے جو فقر و فاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں، لیکن اپنی عزت و آبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں، یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا: مسکین وہ نہیں ہے جسکو ایک درختے در بند پھر آیا کرتے ہیں، صحابہ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے ارشاد ہوا وہ جسکو حاجت ہے، لیکن اسکا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں۔

اس تعلیم کے دو مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دیکھا، اور وہ کہیں رکبیس سے پاہی جائیں گے، ایسے انکی کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں، اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہیے جو صبر و قناعت کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں، کہ انکی خبر بہتوں کو نہیں ہو سکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے کہ بے جا اگر لوگوں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے، اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے۔

شریعت نے مصارفِ زکوٰۃ کی تعیین و تحدید اس غرض سے بھی کی ہے، تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو، اور ہر کس و ناکس اُس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ دیکھ لے، جیسا کہ بعض منافقین اور اہل با دیر نے اس کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا چنانچہ وحی الہی نے ان کی پردہ درسی ان الفاظ میں کی:-

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطُوا مِنْهَا إِذًا هُمْ يُسْخَطُونَ تَوْرَاعِي هُونَ، اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائیں

صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب المسکین الذی لا یجد عنی ولا یفطن له فیصدق علیہ

وَقَالُوا احْسَبْنَا اللَّهَ سَمِيحًا مِّنْهُ
فَضْلُهُ وَرَسُولُهُ اِنَّا لَى اللّٰهِ غٰبِسُونَ
اِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرٰى وَالْمَسٰكِيْنِ
وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالسُّؤْلَفَةِ قُلُوْبُهُمْ
وَفِي التَّرٰقِبِ وَالنَّارِ مِيْنٍ وَفِي
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيضَةٌ
مِّنَ اللّٰهِ (توبہ ۸۰، ۸۱)

کیا حوب تھا اگر وہ اس پر لٹھی رہتے، جو خدا اور اس کے رسول نے
اکمودیا اور کہتے کہ ہم کو اللہ پس ہے، ان کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اسکا
رسول دے رہیں گے، ہم کو تو خدا ہی چاہیے، زکوٰۃ تو حق ہے
غریبوں کا، مسکینوں کا اور اس کا کام کمزوروں کا اور ان کا
جن کا دل (اسلام کی طرف) پر جانا ہے، اور گزرنے پھر آنے
میں، اور خدا کی راہ میں، اور مسافروں میں یہ حقے خدا کی
طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی، آپ نے
فرمایا اسے شخص! اللہ تعالیٰ نے مال زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے، بلکہ اسکی تقسیم
خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اسکا آٹھ مصرف بیان کر دیے ہیں اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں۔

اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشتگانہ ایہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف
کو محیط ہیں، فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمائی کی حجت
نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے، لنگڑے، مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کر سکتے ہیں لیکن موجودہ حالت میں
دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں، کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، مبلغین، مذہبی معلمین، بالغ
طالب علم، جو لفقہاء و اہل الذہن اُحْصُرُوا فِی سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ فِی اَسَى طَرِحٍ وَدَاخِلٍ فِيْ
جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں اصحاب صفہ داخل تھے اور وہ کم نصیب بھنی داخل ہیں جو اپنی
پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر ہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا يَعْنِيْ اِمَامِ كِى طَرَفٍ سِى صِدْقَةٍ كِى تَحْصِيْلِ مَوْسُوْلٍ كَا كَامِ كِرْمِيْ لِيْ سِى اِسْمِ اِسْمِ اِسْمِ اِسْمِ اِسْمِ
اُجْرَتِ پاكے ہیں، اور وَالْمَوْئَلَفَةِ قُلُوْبُهُمْ (جن کی مایوس قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی
اسلام کی طرف مائل کرنا ہے یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے وَفِي التَّرٰقِبِ رُكُوْنٌ كِى چھڑانے میں اس سے مقصود وہ
غلام ہیں جن کی گزرتی دوسروں کے قبضہ میں ہیں اور انکو خرید کر آزاد کرنا ہے، اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ
کسی طرح ادا نہیں کر سکتے، وَالنَّارِ مِيْنٍ رَاوَانِ اُطْحَانِ وَالْوَلِىِّ سِى مَرَادِ وَه لُوْكَ هِى جِنْسُوْنَ نِى دُوْسِرِ سِى لُوْكَوْنَ
اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام
کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جاسکتی ہے وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر
قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی یا سفر خرچ یا اور دوسرے نیک کام مراد لیے

لِى الْاِوَادِ وَد كِتَابِ الزَّكٰوٰةِ، بَابُ مِّنْ يَّعْطِي الصَّدَقَةَ وَهَذَا لِنِى سِى اَكْثَرِ فُقَهَاءِ دِى سَبِيْلِ اللّٰهِ سِى مَرَادِ مَرَفِ جِهَادِ لِيْ سِى مَكْرِى تَحْدِيْدِ
صرف نہیں معلوم ہوتی آیت گذر چکی لِلْفُقَرٰى وَالْمَسٰكِيْنِ اَوْ الَّذِيْنَ اُحْصُرُوْا فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ ہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں
بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہاء نے یہ بھی کہلے کہ زکوٰۃ میں نیک بینی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

جاسکتے ہیں اور وَابْنِ السَّبِيْلِ (مسافروں) میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسائی کے
سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے، یہ ہیں زکوٰۃ کے وہ
آٹھ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔

مسکینوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے،
اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے، ناداریتوں، بیوائوں اور ان لوگوں کی خبر
گیری کی جملے جو اپنی کوشش اور جدوجہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کر پاتے، یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر
قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی قابل افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی
محتاج نہیں، لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کیے ہیں جن کی اہمیت کو خاص
طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے۔

غلامی کا انسداد غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گزرن
سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، انکے ساتھ نیکی، احسان اور حسن
سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا، کہ اس غلاموں
کو خرید کر آزاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلاموں کو آزاد کر نیکی پوری قیمت یا اسکی آزادی کا پورا زائد ہر ایک شخص برداشت
نہیں کر سکتا تھا اس لیے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانوں کے
اس درمازہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جسکی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست میں نظر نہیں آسکتی،
پیغمبر سلام علیہ السلام کی شریعت نے صرف ایسے گناہوں کے اس واجب لرحم فرم کر اپنی کھولی ہوئی آزادی واپس لے
اپنی اہمیت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے
جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں، یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہو جائے۔

مسافر گذشتہ زمانہ میں سفر کی مشکلات اور دقتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بر آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ مسافروں
کی امداد اور ان کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی، صحرا اور بیابان، جنگل اور میدان، آبادی
اور ویرانی ہر جگہ آنے جانے والوں کا اتنا نگار ہتا تھا، اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہیں جو اپنے اہل عیال، عزیزو
اقارب، دوست و احباب، مال و دولت سے الگ ہو کر لطافتات اور حوادث کے سیلاب بہہ کر کہاں سے کہاں نکلے
جاتے ہیں، انکے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اور بھنے کے لئے چادر نہیں ہوتی، اور یہ حالت
ہر انسان کو کسی کسی وقت پیش آجاتی ہے، ایسے ضرورت تھی کہ ان کے آرام و آسائش کا سامان کیا جائے، اسی اصول پر
مراٹھی، کنوئیں، مسافر خانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے، اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں انسا، کن اور داستان پارہ ہو گئی ہیں اب ہر

(بقیہ حاشیہ) ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو لفقہاء و اہل الذہن کے لام تک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے ہو سکتا ہے کہ لام
انصراف ہو، جیسے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا (حاشیہ صفحہ ۱۳۶) کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، باب الصدقات

اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے توڑا مال بھی کافی ہوتا ہے، سو خوار اپنے مال میں اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے، آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا، بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے، اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے اسکو کوئی دوسرا نہیں لوٹتا، وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے، دینکے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کوٹھیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر میں، اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے، پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگ بنیاد ہے بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے، یہ ارشاد فرمایا کہ لیس الغنی من كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس، تو نگرہی دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ نزل کی بے نیازی کا نام ہے، اسی حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے "تو نگرہی بدل ست نہ بھال، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہیں، بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے، لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہیں، بلکہ صبر و قناعت کی بدولت حاصل ہوئی ہے، اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ و صدقہ کے مسطر، مزکی اور مصلح انجمن ہونے میں شبہ ہو سکتا ہے؟

سو خوار کو دوسروں کے لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور وقتوں میں پھنسے اور وہ ان کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ ہمیشہ قابل ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اس کی مدد کر کے اس کے زخم دل پر مرہم رکھ سکیں۔

بابی اعانت کی علی تدبیر | زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجتمندوں کی امداد ہے، انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے جسے ساتھ تمام تدبیروں نے ہمدردی کی ہے، اور اس کی تسلی اور تسکین کے لیے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آئند الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہل مذہب کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہو سکتی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینکے پہلے اور وہی پچھلے پنیر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لیے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی، خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ خداوند! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا، اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر، آپ کے گھر کا چوبترہ (صدقہ) غریبوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزم قدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معرکوں کے مخلص جانناز تھے، آپ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگدستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی، نہ دولت و امارت عزت و وقار کے مترادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری، فیصلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی، حضرت مسیح نے فرمایا کہ مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں

۱۳۰ بخاری کتاب الرقاق باب الغنی غنی النفس

کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا:۔

ان المکتوبین هم المقلوبین

جو دولت مند ہیں وہی غریب ہیں۔

اس کے دوسرے معنی یہ ہونے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے۔

پھر انہیں خوشخبری دی کہ غریب (جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے) دولت والوں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں، جن کا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو فخر اخلاقی ترغیب و تشویق تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے لیے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں، ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے، یہ اخلاقی خیرات ہے، جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں انفاق ہے لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی، اس لیے ایک مقدار مصیبت کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد و اعانت کے لیے مخصوص کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لیے سپرد فرمایا، چنانچہ آپ نے معاذ بن جبل کو اپنا نائب بنا کر مین بھیجا، تو توجید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے، پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ

تؤخذ من اغنیاء ہوترو علی
فقرا ینہم
وہ ان کے دولت مندوں سے لیکر ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے۔

صحابہ نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب و معذور بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دلجوئی کی کہ فرمایا اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے مات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے، اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو، خدا نے تعلیم دی:۔

فَأَمَّا الیَتِیْمُ فَلَا تُقَهِّرْ، وَأَمَّا الِاتِّمِلْ فَلَا تُنہَرْ (خنی: ۱) تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مٹنے والے کو جھڑک۔

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجتمند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو، کہ وہ شرمندہ ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی، احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پالہ حجاب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گا، فرمایا:۔

۱۳۱ صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکتوبین ہم المقلوبین سے جامع ترمذی کتاب الزہد باب باجاء ان فقراء المهاجرین یدخلون الجنة قبل ان ینا تمم صحیح بخاری، جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجمیہ

لَا تُبْلَغُوا مَدَنَ تَنْكِيحِ الْمَلِكِ وَالْأَذَى (بقرہ: ۲۶۰) تم اپنی خیرات کو احسان دہر کر یا طعنے دیکر برباد نہ کرو۔

اس لطف، اس مدارات اور اس دجوتی کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی، اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا، اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا، یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا حکم دیدیا جاتا تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہیں تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہیں، جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سخت ابری کی حالت میں ہے اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے۔

دولتمندی کی بیماریوں کا علاج | دولتمندی اور رسول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکہ آرا، بحث کی حیثیت سے چلا آ رہا تھا، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذاہب ہیں جن میں نہ تو دولتمندی کی کوئی تحقیق گئی اور نہ منطقی اور غربت کو سر لگایا ہے بلکہ گویا اس بحث کو نامفصل چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن عیسائیت اور بودھ مت دو ایسے مذاہب ہیں جن میں دولت کی پوری تحقیق گئی ہے، عیسائیت کی نظر میں دولت مندی اور رسول، نجات کی راہ کا نشانہ ہے، بلکہ کوئی انسان اُس وقت تک نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ میں لٹا نہ دے، انجیل میں ہے کہ ایک نیکو کار دولتمند نے حضرت عیسیٰ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا: اگر تو کامل ہو چاہتا ہے تو جاکے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانے ملے گا، تب آکے میرے ہولے۔

وہ دولتمند یہ تعلیم سن کر ٹلگن ہو کر چلا گیا، تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا:۔

میں تم سے کچھ کہتا ہوں کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سونے کے ناکہ سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔ (متی ۱۶-۲۱-۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی، اور ایسے لوگوں کے لیے یہ سامان کیلئے ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لیکر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بڑی چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہ ہوتی، دشمنی ہوتی اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دیکر خود اسی حال میں بن جانا کہاں کی دانستندی اور اصلاح ہے اسلئے یہ طریقہ ہر شخص کے لیے یکساں مفید نہیں ہے، نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے جس طرح دولتمندی دنیا میں ہزاروں سیرکاریوں کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں کے انسانوں کا بچانا ایک نبوت منطقی کا فرض تھا، دولت برحیثیت دولت اور غربت برحیثیت غربت نیک بد اور

خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے، بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکو کار دولتمند ایک نیکو کار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لیے دولت اسلام کی نگاہ میں خدائی ایک نعمت ہے، لعنت نہیں، ہنر ہے عیب نہیں، خیر ہے شر نہیں، چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر دولت کو خیر اور فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیں، آپ نے فرمایا کہ تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھر اس آپ کے حلقہ بگوشوں میں دولتمند بھی تھے اور غریب بھی، اور دونوں آپ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے، ایک نفع غریبوں نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے دولتمند بھائی تو ہم سے سبقت لیے جاتے ہیں ہم جو نیکی کے کام کرتے ہیں وہ وہ بھی کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہیں، جو ہم نہیں کر پاتے، آپ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو، دولتمند صحابیوں نے یہ سنا تو وہ بھی دعا پڑھنے لگے، غریبوں نے پھر جا کر عرض کی، تو آپ نے فرمایا کہ یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور نلے شدہ چلا آ رہا تھا اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لیے حل کر دیا، ایک دفعہ آپ نے تقریر میں فرمایا کہ لوگو! مجھے تمہاری نسبت جو ڈر ہے وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے فرمایا دنیا کا باغ و بہار، رعیش و نشاط اور مال و دولت، ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! کیا بھلائی سے بھی بڑی پیدا ہوتی ہے؟ سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیونکر ہو سکتی ہے آپ نے سوال سن کر ذرا تامل کیا، پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھے، پھر فرمایا بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرم و طمع میں آکر حد اعتدال سے زیادہ کھالیتے ہیں تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتی ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتی ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے، فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور پھر چرنے لگتا ہے دولت ایک خوشگوار چیز ہے، تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لیے بہترین مددگار ہے، لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔

اس تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرما دیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہیں ہے، بلکہ اس کا درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے، اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ

۱۔ بخاری کتاب ابو صلیاب ان یرک درشتہ اغنیاء غیر من ان یتکفوا الناس ۱۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم باب استجاب الذکر

بعد الصلوٰۃ ۲۔ صحیح بخاری کتاب الاکوٰۃ، و کتاب الزہد و الرقاق باب ما یحذر من زہرۃ الدنیا ۳۔

صحیح نہیں، تو وہ بری اور شرانگیز ہے، اخلاقی محاسن و معائب، امیر و غریب دونوں کے لیے یکساں ہیں، ایک سخی و فیاض و متواضع امیر، اور ایک قناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں، اسی طرح ایک متکبر بخیل امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر بستی کی ایک ہی سطح پر ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امراء اور دولت مندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فقیروں کی امداد اور دستگیری کے ساتھ ان کے اخلاق اور عادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام میں زکوٰۃ اسی عظیم الشان دو طرفہ اصلاح کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقوں، دھوکا فریب، خیانت لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی، سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی اور اس کے سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لوٹنے کے سبب عام طریقہ سود کو حرام مطلق، اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا، جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اسکو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے، اسی کی ملک قرار دی، چنانچہ فرمایا "زمین خدا کی ہے، اور سب بندے خدا کے بندے ہیں جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے" (اطہالی صفحہ ۲۰۴) مگر وہ جائیداد کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنا دیا۔ مالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہیں، بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا، فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف میں دیا، اور بن لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امراء اور دولت مندوں کے بجائے خالص غریبوں اور بیکسوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی۔

مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِلَّذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَإِنَّ السَّبِيلَ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (حشر: ۱)

بیتوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو ہاتھ لگا دے وہ خدا اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے، تاکہ وہ الٹ پھرتے نہیں سے دولت مندوں ہی کے لینے دینے میں نہ رہ جائے۔

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولت مندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین منظر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا، اور جو اس گناہ سے پاک ہو اسی کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا :-

وَمَنْ يُؤَقِّ شَحْمَ نَفْسِهِ فَأُوَّالَيْكَ هُمْ السُّفْلٰهُونَ (حشر: ۱)

اور جو اپنے جمی کی لالچ سے بچا گیا وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔

بخل کا ابتلاء دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر و لعزیزی اور نیکیا می بلکہ جائز آرام و راحت تک اور آخرت میں ثواب کی نعمت محروم رکھتا ہے، فرمایا:

وَمَنْ يَبْخُلْ نَانَمَا يَبْخُلْ عَن نَّفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (محمد: ۳)

اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے، اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

اس آیت پاک میں درپردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمہاری نہیں اصل مالک خدا ہے، اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت میں کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؛ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے، دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے اس آیت پاک کی یہ تعلیم اس جڑ کو کھودتی اور یخ و بون سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا۔

ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (نکاح: ۱)

پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائیگا۔ اس لیے ان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں، ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تنبیہ کی:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ، يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلًّا (ہمزہ: ۱)

برائی ہو اس کی جو طعنے دیتا، اور عیب چناتا ہے، جو مال کو سینت کر رکھتا ہے، اور اس کو گن گن کر ٹیخا کرتا ہے کہ اسکا مال اسکے ساتھ سدا رہے گا، ہرگز نہیں۔

فرمایا، رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے ایک تو اس پر جسکو خدا نے علم دیا ہے، اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے، جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہیں اور کار خیر میں خوب خرچ نہ کرتے ہوں ان کو خطاب کیا:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (توبہ: ۳۴)

وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں، اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیے، ایک کتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہیے، کل کے لیے کچھ نہ رکھنا چاہیے ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا، دوسرا کتا تھا، خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں، لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گہرہ کھول دی، حضرت موسیٰ کی توراہ میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں، اور حضرت عیسیٰ کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنیاں اسی کے حوالے کی گئی ہیں، جو سب کچھ خدا کی راہ میں نٹا دے، یہ دونوں تعلیمیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی لہ بخاری کتاب العلم باب الاعتباط فی العلم والحکمتہ :-

تخیل ہے مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرے سے باہر ہے اور اسی لیے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے، اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیئے، ایک قانونی اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی، یعنی نصف مشقال نقدیں اور عشر پیدوار میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصاب پر واجب ہے، اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے، اس کو حضرت عیسیٰ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا، اور بلند بہت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی، صحابہ میں دونوں قسم کے لوگ تھے جو کل کے لیے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے، جیسے حضرت ابو ذرؓ اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولتیں اسلام کے قدموں پر لاکر ڈال دیتے تھے جیسے حضرت ابو بکرؓ، اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے، جیسے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے، جیسے حضرت علی مرتضیٰؓ، اور بعض انصار کرام، خدا نے انکی مدح فرمائی:

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مَشْكُتًا
وَيَتِيهًا وَآسِيئًا زَاهِرًا

اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ
بِهِمْ حَصَصَةٌ (حشر: ۱۱)

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہے اور ہر ایک کے لیے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے، اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لیے ظاہر وقت امداد مل سکے، اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لیے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور بڑائیاں بھی بیان کر دی ہیں تاکہ امت کے با حوصلہ افراد بہت کے شہروں سے اڑ کر اس سداۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبہ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

وایں طائفہ، جان و مال در باختہ اند و با پیچ
کس ما سوال اللہ نہ پر و اختہ اند، گفتہ ایشان است
الفقیہ مالہم مباح و دمہ ہدمہ
یعنی درویش صادق آن بود کہ بخون و مال اورا
ادعوی نبود.... اگر مالش بر بند خوش گرد، گوید
اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو مار دیا ہے اور خدا کے
سوا کسی سے دل نہیں لگایا، اس کا مقولہ ہے کہ درویش
وہ ہے جس کا مال وقف اور جس کا خون معاف ہو اسکو
اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو.... اگر لوگ اسکا
مال اٹھالیں تو خوش ہو کہ الحمد للہ اس کے درخدا

لہ بخاری کتاب الزکوٰۃ باب مادی زکوٰۃ فلیس بکنزہ ترمذی کتاب المناقب ففائل ابی بکرؓ اسد الغابہ جلد ۲ صفحہ ۳۱۶

الحمد للہ کہ حجابے از پیش من برداشتند تا گفتند از
زکوٰۃ نعمت دنیائے نزدیک این طائفہ محمود نہا شد،
از آنکہ بخل ناستودہ است و بخلی تمام باید تا دوست
درم را در بند کند، و یکسال محبوس دارد، آنگاہ
پنچ درم ازالا بدہد۔

کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا وہ اٹھ گیا یہاں تک کہ
ان کا کنایہ ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کر کے زکوٰۃ دینا چاہی
نہیں ہے کیونکہ بحالت تعریف کے قابل نہیں، اور اس کیلئے
سال میں دو سو درہم جمع ہوں اور پھر وہ ایک سال تک بند
پڑے رہیں، تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درہم لوٹیں
سے خدلی راہ میں سے، بڑی نجات کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا فتویٰ نقل کیا ہے:-
یکے از فقہاء بر سبیل آزمایش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را
پرسید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید، گفت جواب بر
مذہب فقیہان خواہی، یا بر مذہب فقیہان؟ گفت
بر ہر دو جواب فرما، شبلی گفت، بر مذہب فقیہان
از دولت درم بعد از حوالان سول پنچ درم باید داد،
و بر مذہب فقیہان در حال ہر دولت درم باید
داد و جان بشکرانہ بر سر باید نہاد، فقیہ گفت این
مذہب از آئمہ دین گرفتیم، شبلی گفت ما این مذہب
از صادق رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی
اللہ عنہ، او ہر چہ داشتہ پیش سید عالم صلی اللہ علیہ
وسلم نہاد و جگر گوشہ ثور شین بشکرانہ داد، (مکتوب
۳۴ - سرمدی)

کسی نے حضرت شبلیؒ سے استفسار کیا کہ زکوٰۃ کتنے پر
ہوتی ہے فرمایا فقہ کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقہ
کے، کہا دونوں کے، فرمایا فقہ کے مذہب کے
مطابق ایک سال گزرنے پر دو سو درہم میں پانچ
درم اور فقہ کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے
دو سو۔ اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان بھی
سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہیے۔ فقیہ نے کہا ہم نے
یہ مذہب اللہ دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا ہم نے
یہ مسلک ہدیٰ ابراہیم رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا ہے
کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے
سامنے رکھ دیا، اور اپنی جگر گوشہ حضرت عائشہؓ کے
کو شکرانہ میں دیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی مثال اسی دوسرے فرقہ کے مطابق تھی، آپ کے پاس طرہ بھر کبھی اتنا
جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا تو اسی دن اہل استحقاق میں تقسیم ہو جاتا، اگر گھر میں زرات کو سونے چاندی
کی چند خرف ریزے بھی پڑے رہتے تو گھر میں آرام نہ فرماتے، مگر عام امت کے لیے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار
دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لیے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت استطاعت اور بہت کے مطابق ہو تاکہ نجات کا دروازہ عزیزوں
اور دولت مندوں کے ہر طبقہ کے لیے یکساں کھلا رہے اور اس لیے تاکہ بے قیدی و عدم پابندی لوگوں کی کستی اور عدم
عمل کا باعث نہ ہو، مقدار معین کے مالک ہر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی، تاکہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لاکھ
طور سے دستگیری ہوتی رہے۔

اشترکیت کا علاج | دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے، ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے
مختلف افراد کے درمیان دولت کی نیر مساوی صورت یعنی طور پر پیدا ہو جاتی ہے، بعض طبقہ نہایت دولت مند ہوجاتے

ہیں جن کے خزانوں کے لیے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لیے ایک سوکھا ٹکڑا اور سونے کے لیے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی، اور دولت مند طبقوں کی خود غرضی، خود پسندی، عیاشی، اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چھوٹا سا تھوکے کے روادار نہیں ہوتے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاقی دولت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ان کے علم و ہنر سے حاصل ہوئی ہے اور وہ اس لیے ان سست و ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں، قارون کو جب زکوٰۃ اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے اس لیے ان سست و ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں، قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا تو اس نے جواب میں یہی کہا:

إِنَّمَا فُتِنْتَهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي (قصص: ۸) مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب ملا ہے۔

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔

یونان کے آخری دور میں ہی صورت پیدا ہوئی، ایران کا انتہائی زمانہ میں ہی مشکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا میں سی آب و ہوا، اقتصادی مشکلات کے ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم، اور بالٹوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لیے یہ دنیا کے نئے نئے ٹھکانے تیار کر نیوالے جو نکتے بنا رہے ہیں وہ انسانی فطرت و تربیت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ انکی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا، اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لیے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے، سود کو حرام قرار دیا، مقررہ جائیداد کو صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا، نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بجائے جماعت کی ملک قرار دیں، قیصریت اور شہنشاہیت کے بجائے جماعت کی حکومت قائم کی، زمینداری کا پُرانا اصول جس میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدل دیا، اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو لیکر تمام انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تاکہ دنیا میں کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لیے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تاکہ وہ اسکے ادا کرنے پر مجبور ہو، اور جماعت کا فرض قرار دیا کہ وہ اس رقم سے قابل اعانت لوگوں کی دستگیری کرے یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا، اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اتنے رقیب میں جتنے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی حکومت ہے، پیدا نہیں ہو سکتے، خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمان کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراد کی حد تک پہنچ گئی تھی، حضرت ابوذر غفاری نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ جو لوگ سونا چاندی کا ڈگر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے اور ہر شخص کے پاس جو

کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دیے اور شام کے دولت مند صحابہ نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دیکر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذر کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ علوم میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی، کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنا بالاباقی نہیں رہا۔

اقتصادی اور تجارتی فائدے | زکوٰۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے بناؤ فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں، اور پرگزر چکے کہ زکوٰۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں یعنی بقا اور نمو، بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں، کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے، اور نہ وہ دوسروں کے استعمال کے لیے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لیے سبز یوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور نموسے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تاسل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو، اسی لیے جو اہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزدور زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں، بلکہ محنت و کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائے گی، جس کو فطرۃ کوئی برداشت نہیں کر سکتا اس طرح زکوٰۃ کا بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دیا جائے، کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو، یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا جن میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو، اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لیے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے، صحابہ کرام اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے، حضرت عمر نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایوں کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ انکو تجارت میں لگائیں تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں مال کا اکثر حصہ بیچارہ زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کر کے یہ نکتہ بتا دیا تھا۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ
وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (توبہ: ۳۵)

اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گرا کر رکھتے ہیں، اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے، ان کو سخت دردناک عذاب کی بشارت دو۔

یہ دردناک عذاب قیامت میں تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا، اس دنیا میں بھی ان کے لیے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہیں، اور اس سے دولت کی افزائش اور ترقی کا کام

لینے کے بجائے اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذاب الیم میں مبتلا کرتے ہیں اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہیں، ایسے امراء کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی میں ہے، کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کریں۔
فقراء کی اصلاح | اب دوسری طرف فقراء کا گروہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام شاربین ذہاب نے انسانوں کے اس قابل رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور رحم کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اُس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور وہ ٹوٹنے نہ پائے اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو حیرے کہ ان باتوں سے اس کو تکلیف ہوگی کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا۔

گذشتہ معلمین نے عموماً اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے، بعض نے تو اس زخم میں صرف نشتر ہی لگایا ہے، اور مرہم کا کوئی پھاہ نہیں رکھا، چنانچہ زروشتی مذہب میں سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل بودھ مذہب میں اس زخم کو سر تھاپا مادہ فاسد بننے دیا گیا ہے اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے لیکن اسلام نے منایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور اس پھوڑے کو دور کرنے کے لئے ایک بھر بھرا کا مادہ ہر جراح کی طرح دونوں عمل کیے ہیں، اس نے اس ننگین اور درد مند طبقہ کے زخم میں نشتر بھی لگایا ہے اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں اور عملی امداد و اعانت کی تدبیریں ہیں، جو اُس کے دل کی ڈھارس، اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں، اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو دنائت، پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسروں کی دست نگرہ اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کیں، اس لئے اہل حاجت کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی، لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو، اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو، منایتِ اعلیٰ اخلاقی تعلیم، اور رحم و محبت کا نہایت بلند منظر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دو لتمدوں کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں، اور اس سے دینے والوں کے جذبہ ایشا را در ان کے جو دوسرا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا تجربہ بنا رہے ہیں اور بے محنت کھانے، اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں اس طرح ان کے لیے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی، اور تمام رذیل و پست اخلاق کا گڈھا تیار کر رہے ہیں، جہاں یہ تمام بنجائیں اگر جمع ہونگی، کیا یہ انسانیت کے سلسلہ رحم ہے، کیا یہ نوع بشر کی ساتھ محبت ہے، کیا یہ جنس بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟
 پیغمبر اسلام علیہ السلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی، وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم

بنا کر بھیجے گئے ہیں، غریب و امیر اور مسکین و دولت مند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں، اس لیے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا، بلکہ دونوں طبقوں کو ترازوں کے دونوں پلڑوں میں لکھ کر برابر باٹ سے ناپا ہے، اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے جس پر نبیوں کے خاتم اور دینوں کے تکمیل علیہ السلام کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلم، اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے، اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلوں کو برابر رکھ سکا، اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ و خیرات اور دوسروں کی اعانت و ہمدردی کے تمام دنگازے بند کر دیے جائیں تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امراء کا طبقہ اپنے اخلاقی معائب کی فزانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہو جائے گا، اور اگر غریبوں اور فقراء کو ہر قسم کی گداگری اور درویش گری کی اجازت دے دی جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی، اسی لیے واپی اسلام علیہ السلام نے، انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت مل گئی، ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولت مندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا۔

أَمْ أَسْأَلُ فَلَا تَشْكُرُ (ضحیٰ: ۱)

مانگنے والے کو بھیک نہ دے۔

دوسری طرف خود داروں بے نیاز فقراء اور غریبوں کے طبقہ کی مدد فرمائی۔

يَحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعْفُفِ

ناواقف انکی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے

تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ

سب سے ان کو دولت مند سمجھتے ہیں، تو انکو اپنی نشانی سے

النَّاسِ الْجَاهِلِ (بقرہ: ۲۴)

پہچانتا ہے، وہ لوگوں سے پٹ کر نہیں مانگتے۔

اور بھیک مانگنے کو خلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر گرج کرتے تھے انکو خطاب کر کے کہا:

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ

اور زاد راہ لے کر چلو کہ بہترین زاد راہ تقویٰ

التَّقْوَى (بقرہ: ۲۵)

(بھیک نہ مانگنا) ہے۔

ایک طرف دولت مندوں کو فرمایا کہ تمہارا حسن اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اُس کو خالی مت لٹاؤ وَلَوْ بِشَيْءٍ تَمْرَةٍ اَلْجَرِيَّةِ جھوٹے روپے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو: دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ تمہاری خودداری یہی ہونی چاہیے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ الیحد العلیا خیر من الید السفلیٰ اذیر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا، اور دونوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

صدقہ و خیرات درحقیقت وہ بانی ہے جو دینے والوں کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک و صاف بنا دیتا ہے لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لیکر باہر نکلتا ہے تو حرص و طمع کے پیالے اسکو

لہ بخاری کتاب الزکوٰۃ باب التواضع والویشق تمرہ لہ ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلة

چلو میں لے کر پینے لگے ہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان هذه الصدقات انما هي اوساخ الناس یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے۔

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاق شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو نظر آجائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی تنازع ہیں ان میں سے کوئی چیز ہے جو غیر مستحق انبیا و اہل بیت، فقراء اور مہذب گداگروں کا تمنا کرنے اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقراء اور گداگروں کے دامن دل کو نجس بنا دیتا ہے تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرۃ ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جب نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کیلئے گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ و خیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے، شریعت محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے اور اس مجبورانہ قبول سے اس گندہ کے اخلاق و عادات پر جو بڑے اثرات طاری ہو سکتے ہیں ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مفر بنانے کیلئے مفید تدابیر اختیار کی ہیں اور چند نہایت مناسب احکام جاری کیے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتہً لوجہ اللہ ادا کیا جائے، یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس پر مسنون کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے دیا جائے، کیونکہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی اور دنائت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خود داری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اور بچانے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو، اس کو اس کے اس نعل سے پہلے سے تو نفرت ہوگی پھر رفتہ رفتہ شاید اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے یا ان میں بڑے طرف کے شرف و انفس لوگ ہوں، وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کر کے اپنی جان پر کھیل نہ جائیں۔

اسلام نے انھیں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی، کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ:

إِنَّمَا نَطْعُكُمْ لِرُؤْفَةِ اللَّهِ لَا تَرِيدُ ہم تم کو خدا کے لیے کھلاتے ہیں، ہم تم سے کوئی

مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا (دہر: ۱) بدلہ اور شکر یہ نہیں چاہتے۔

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکر گزاری بھی نہیں چاہیے پھر صدقہ دینے والوں کو یہ بھی بتھریج بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے یا لینے والے کو ذلیل و رسوا کرنے سے تمہارا اس عظیم شان کا نامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی اور تمام ثواب خیرات کی طرح تمہارا نامہ اعمال سے مٹ جائے گا، فرمایا:

لے مسلم کتاب الزکوٰۃ باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقۃ ۛ

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي

سَبِيلِ اللَّهِ تَسْرًا وَلَا يُبْعَثُونَ مَا أَنْفَقُوا

فَمَا قَوْلَا أَدَىٰ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ

رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَحْزَنُونَ، قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ تُتْبَعُهَا

أَذَىٰ ط وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ

(بقرہ: ۲۶۰)

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، نہ طعنہ دیتے ہیں، ان کا اجر ان کے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خدشہ اور نہ وہ ٹمکین ہوں گے، کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی کر کے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے، خدا تمہاری ایسی خیرت سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر بردباری سے درگزر کرنے والا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دل نشین تشبیہ سے واضح کیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا

صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي

يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ

صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ

وَأَبِلَ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ

عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (بقرہ: ۲۶۰)

مسلمانوں اپنے صدقوں کو احسان جتاکر اور طعنہ دیکر برباد نہ کرو، میرے کردہ اپنے صدقوں کو برباد نہ کرنا کہ جو بعض لوگوں کے دکھانے کو دیتا ہے اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا، اس قسم کی خیرت کی مثال اس چٹان کی ہے جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو، اور اس پر ایک پانی بڑھ گیا ہو جس نے اس کو صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے، ان لوگوں نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے خدا کا فرد کو بدایت یا ب نہیں کرتا۔

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں، بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اس طرح غریب لینے والے مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنون احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے، اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقراء اور معذوروں کو در بدر کی شکوہ کھانے کی رسوائی اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے۔

۲۔ اسی لئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے، کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے کیونکہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے تو پھر اپنے نعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی اور اس لئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دنیا میں گنا گری و ریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بن جائے گا اور یہ اختفاء اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نمائش اور شہرت طلبی کی آلائشوں سے اپنے اخلاق

کو محفوظ رکھ سکے گا۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بہتر صدقہ وہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔"

لیکن بعض موقع ایسے بھی ہیں کہ جہاں صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کر کے مجمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک عرض شامل ہو، چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا :-

ان تَبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ
ان تَخْفَوْهَا وَتُوْنُوْهَا الْفُقَرَاءُ فَهِيَ
خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ: ۲۷۰)

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفاء کو عام خیرات کے ساتھ مخصوص کیا ہے، مگر فرض زکوٰۃ کے لیے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے کہ اس سے اسلام کے ایک رکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس کی پیردی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کیے جاتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے، زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبوتی میں تھا یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے، اسلئے اخفاء کا جو فائدہ فقراء کے حق میں ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے، اسی لیے جس آیت میں اعلان کی اجازت ہے اس میں فقراء کو براہ راست دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفاء کیساتھ دینے کا ذکر ہے، وہاں فقراء کو دینے کی تصریح ہے، اسلئے اعلان اور اخفاء کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے، کہ اگر بیت المال و نائبین بیت المال کے ذریعہ ادا کر دو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے، اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے، لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے جس میں حساب کتاب کی ضرورت نہیں، اور براہ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے، بیت المال کا پردہ پیچ میں نہیں ہے اسلئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو، تاکہ دینے والا ناامنی سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے، پھر ترغیب، اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوق اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکروں کی ضرورت ہو، ورنہ صحابہ کرام کی ترغیب کے لیے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سے معمولی رقم کے لیے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ کر دیے جائیں، دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

۳۔ تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے، بلند ہمتی کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ ٹھہرے اور اسکو دنیا کی تمام چیزیں بیخ نظر آئیں، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ و صدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ مبتدل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفاء الصدقۃ :-

۱۔ والے اور لینے والے کے اندر سستی اور دنائت نہ پیدا ہو، کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کالاج اور چھپور پن پیدا ہوگا کہ معمولی اور سستی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے نجالت، حرص اور کینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی کیونکہ کوئی بری چیز کسی کو دینے کا منشاء دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا، بلکہ اس بیکار اور سستی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے اس لیے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے، روایتوں میں ہے کہ اصحاب صفحہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لیے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدوں میں لٹکاتے تھے، اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بیتاب ہو جاتا تھا، تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھالیتا تھا چڑھ کر یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا كَسَبْتُمْ وَّوَمِمَّا اٰخَرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ
الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَسُّوْا الْخَبِيْثَ مِنْهُ
تُنْفِقُوْنَ وَّلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ الْاَلٰتِ
تَغْمِضُوْنَ وَاَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ
غَنِيٌّ حَسِيْبٌ (بقرہ: ۲۷۰)

۴۔ فقراء اور مساکین کی دنائت اور حرص و طمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگدستی اور بے بضاعتی کے خود داری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کیونکہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی، تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مغلس اور نادار اصحاب صفحہ تھے، لیکن ان کی خود داری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی اس بنا پر اسلام نے ان کو زکوٰۃ کا بہترین مستحق قرار دیا۔

لِلْفُقَرٰٓءِ الَّذِيْنَ اٰحْصَرُوْا فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ
يَحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ اَعْيٰٓاءٌ مِّنَ
التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ
لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ الْخٰفِا (بقرہ: ۲۷۰)

۵۔ آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی درود کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔
لیکن بائیں ہر جزم و احتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے، اس بنا پر اسلام نے سخت جبری

کی حالت میں اس کی اجازت دی، اور جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہ مانگیں گے انہوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا دو، ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے میں یہ ضمانت کرتا ہوں، چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔

حکیم بن حزام ایک صحابی تھے، انہوں نے ایک دفعہ آنحضرت سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا اسے حکیم! یہ مال بنلا ہر نہایت شیریں اور خوش رنگ چیز ہے جو اس کو شہادت کے ساتھ لینگا، اس کو اس میں برکت دیکھائے گی، اور جو لالچ کے ساتھ لے گا، اس کو برکت نہ ملے گی اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھانا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے اور پھر کالٹھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے حکیم نے کہا یا رسول اللہ! آج سے میں پھر کبھی کچھ نہ مانگوں گا، اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خلفاء ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لیے بلاتے تھے، اور وہ انکار کرتے رہے، اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے۔

اس کی متعدد اور مثالیں ہیں، اس عمومی مانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لیے جو صاحب دست و بازو ہوں، یعنی جن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں صحیح و سالم ہوں بھیک مانگنے سے سخت مانعت کڑی گئی، فرمایا کہ لا تحمل المسئلة لرجل قوي، ولا لذی صرة سوتی (ترمذی)۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا :-
والذی لفضی بیدہ لان یاخذ احدک وحبلہ فیحطب علی ظہرہ
خیر لہ من ان یاتی رجلا فیسألہ اعطاه او منعه (کتاب الزکوٰۃ باب الاستغفار من اللہ) مانگنے، وہ اُسے دے یا نہ دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا، ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی، آپ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ ہے، عرض کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے آپ نے ان کو منگو کر نیلام کیا اور انکی قیمت سے ایک کلباڑی خرید دی اور فرمایا کہ جنگل سے کٹڑی کا ٹاٹ، اور چو، انہوں نے اس پر عمل کیا، تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ بچے رہے۔

۶۔ لیکن جو لوگ بدمستی سے کسب معاش نہیں کر سکتے، ان کو بھی الحاح، کثرت سوال، بجاہت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ مانعت کی، آپ نے فرمایا :-

لیس المسکین الذی ترده الاکلثة
والاکلتان ولكن المسکین الذی لیس
لہ غنی ویستحی ولا یسأل الناس الحافا
بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول اللہ عزوجل یسألون الناس الحافا

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ ہر حال میں انسان کی شرم و حیا اور غیرت و آبرو کو برباد کر دیتا ہے، فرمایا :-

ما زال الرجل یسأل الناس حتی یاتی
یوم القیامة لیس فی وجہہ مضغۃ لحم
بخاری کتاب الزکوٰۃ باب من سأل الناس تکثرا
کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا میں مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت و آبرو کی رونق خود دھو دی تھی۔ ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا اور ان تمام برائیوں اور بد اخلاقیوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوردی سے انسانوں میں پیدا ہو سکتی تھیں اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلٹے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا، پست و بلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کر دیئے اور اس اقتصاد کی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھینانگ شکلوں سے اسکو ڈرایا کرتی ہے۔

آنحضرت کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مند صحابہ میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین و ملت کی خدمت کے لیے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے اور غریب صحابیوں میں یہ فقاہت اور خودداری پیدا ہو گئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ دولت مند اپنی زکوٰۃ آپ لیکر بیت المال کے دروازوں تک خود آتے تھے اور غریب اپنے افلاس و حاجت کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے اور تیسری طرف آنحضرت کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرف مصرف کے لیے کسی محسوس نہیں ہوتی تھی، ضرورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ ایک ایسا مالی و اقتصادی نظام تھا کہ بلا نفع قرض دینے میں افراد کو جو تامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا اور سود کی لعنت کے بغیر وادوستہ کار راستہ کھلا ہوا تھا۔

۶۔ لیکن جو لوگ بدمستی سے کسب معاش نہیں کر سکتے، ان کو بھی الحاح، کثرت سوال، بجاہت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ مانعت کی، آپ نے فرمایا :-

روزہ

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ)

روزہ کا مفہوم | روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے عربی میں اس کو 'صوم' کہتے ہیں جس کے لفظی معنی روکنے اور چپ رہنے کے ہیں۔ بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں 'صبر' بھی کہا گیا ہے جس کے معنی ضبط نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہواؤ ہوس اور یہی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص ہوا کے ڈنگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضبط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا منظر میں چیزیں ہیں، یعنی کھانا اور پینا اور عورت اور مرد کے جنسی تعلقات، انہیں سے ایک مدت متعین تک روکنے کا نام شرعاً روزہ ہے لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ | روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں۔ انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنر اپنی تصنیف پرینسپلز آف سوشالوجی (اصول معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی تشریح اور استقراء کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتداء اصل میں اس طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور بکھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مردوزن کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ قیاس ارباب خورد کی نگاہ میں سبب قبول حاصل نہ کر سکا۔

بہر حال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتدا حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتداء اور نایت کی تشریح میں اپنے پیروں کی وکالت کا محتاج نہیں اور بہ آواز بلند مدعی ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ
مما كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
..... شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ
الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى
وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْيَصُمْهُ، وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ
مسلما نو اور روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم
پہلی قوموں پر فرض ہوا تاکہ تم پر بہتر گار بنو
..... ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو
انسانوں کیلئے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیلیں، اور
حق و باطل میں فارق بن کے آیا تو جو اس رمضان کو
پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو،
یا سفر پر ہو، وہ دو گنہگاروں میں رکھے، خدا آسانی

لہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۴ طبع گیارہ :-

الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلَا كُمُلُوا
الْعِدَّةَ وَلِتُكْتَبُ لَكُمْ عَلَى مَا هَدَاكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (بقرہ: ۲۳)

چاہتا ہے، سختی نہیں تاکہ تم روزہ کی تعلد پوری کر لو،
اور اگر روزہ ایسے فرض ہوا تاکہ تم خدا کے اس ہدایت
پر اس کی بڑائی کرو، اور تاکہ تم شکر بجا لاؤ۔

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام، بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ماہیت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں ذیل کے صفحات میں بتدریج ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔ روزہ کی مذہبی تاریخ | قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جزو رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر امی جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا۔ وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ تمام تر صحت پر مبنی ہے، تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے۔

روزہ کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا، قومیت تہذیب اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن ہر شکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

انگے چل کر لکھتا ہے :-

گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں ہندو مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوتے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں ہر دو شنبہ کو روزہ رکھتے ہیں، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں، یعنی چالیس دن تک اکل و شرب سے احتراز کرتے ہیں، ہندوستان کے تمام مذاہب میں یعنی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں، چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے، گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے، یونان میں صرف ٹور میں تقویر یا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی ہیں، پارسی مذہب میں گو عام پیروں پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤں کیلئے پنجابہ روزہ فرضی تھا۔ یہودیوں میں بھی روزہ فریضۃ الہی ہے، حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گزار کر خروج

۳۳، ۳۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں، لیکن چالیس دن کا روزہ ان پر فرض ہے، جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لئے اسکو عاشورہ (دسواں) کہتے ہیں، یہی عاشورہ کا دن، وہ دن تھا، جس میں حضرت موسیٰ کو تورات کے دس احکام

لہ ان تمام حوالوں کے لئے دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳ طبع یازدہم :-

عنایت ہونے تھے اسی لیے تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے، اس کے علاوہ یہودی سمیٹوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی تبصریح مذکور ہیں۔

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، چنانچہ عیسیٰ نے بھی چالیس دن تک روزہ جنگل میں رکھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام جو حضرت عیسیٰ کے گویا پیشرو تھے، وہ بھی روزے رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی، یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھائے تھے اور زیادہ تر غم کے روزے تھے اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لیے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ ادا اس اور غمگین بنا لیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا، غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے، حضرت عیسیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:-

”کیا براقی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں جب تک دولہا ان کے پاس ہے روزہ نہیں رکھ سکتے، پر وہ دن آئیں گے جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا، تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے“ (مرقس ۲: ۱۸۰)

اس تلمیح میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰ کی ذات مبارک اور براقی سے مقصود ان کے پیرو اور خوری ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر نبی امت میں موجود ہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں، انہیں فقر و غنا ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں، بلکہ غم کے مبتدعانہ روزوں کو منع فرمایا، انہوں نے خود اپنے پیروں کو بے ریا اور مخلصانہ روزے رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں:-

”پھر جب تم روزہ رکھو یا کاروں کی مانند اپنا چہرہ ادا نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں، کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تم روزہ رکھو، اپنے سر میں تیل لگاؤ، اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوٹیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوٹیدگی میں دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے“ (متی ۶: ۶-۷)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم لمپید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں، وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

”یہ جنس سوائے دعا، اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی“ (متی ۱۷: ۲۱)

اہل عرب بھی اسلام سے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورہ (یعنی دسویں محرم کو) اس لیے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا، مدینہ میں یہود اپنا عاشورہ

لے تورات، سفر الاجار ۱۶-۲۹-۳۴ (۲۳-۲۴) اول سمویل ۷-۶ ویرمیا ۶-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۵-۱۴۶-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷-۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۳۳-۴۳۴-۴۳۵-۴۳۶-۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۵۹-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۷۲-۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۳-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۴-۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸-۵۵۹-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۳-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۵۸۵-۵۸۶-۵۸۷-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۵۹۳-۵۹۴-۵۹۵-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷-۶۰۸-۶۰۹-۶۱۰-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۷-۶۱۸-۶۱۹-۶۲۰-۶۲۱-۶۲۲-۶۲۳-۶۲۴-۶۲۵-۶۲۶-۶۲۷-۶۲۸-۶۲۹-۶۳۰-۶۳۱-۶۳۲-۶۳۳-۶۳۴-۶۳۵-۶۳۶-۶۳۷-۶۳۸-۶۳۹-۶۴۰-۶۴۱-۶۴۲-۶۴۳-۶۴۴-۶۴۵-۶۴۶-۶۴۷-۶۴۸-۶۴۹-۶۵۰-۶۵۱-۶۵۲-۶۵۳-۶۵۴-۶۵۵-۶۵۶-۶۵۷-۶۵۸-۶۵۹-۶۶۰-۶۶۱-۶۶۲-۶۶۳-۶۶۴-۶۶۵-۶۶۶-۶۶۷-۶۶۸-۶۶۹-۶۷۰-۶۷۱-۶۷۲-۶۷۳-۶۷۴-۶۷۵-۶۷۶-۶۷۷-۶۷۸-۶۷۹-۶۸۰-۶۸۱-۶۸۲-۶۸۳-۶۸۴-۶۸۵-۶۸۶-۶۸۷-۶۸۸-۶۸۹-۶۹۰-۶۹۱-۶۹۲-۶۹۳-۶۹۴-۶۹۵-۶۹۶-۶۹۷-۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰-۷۰۱-۷۰۲-۷۰۳-۷۰۴-۷۰۵-۷۰۶-۷۰۷-۷۰۸-۷۰۹-۷۱۰-۷۱۱-۷۱۲-۷۱۳-۷۱۴-۷۱۵-۷۱۶-۷۱۷-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۱-۷۲۲-۷۲۳-۷۲۴-۷۲۵-۷۲۶-۷۲۷-۷۲۸-۷۲۹-۷۳۰-۷۳۱-۷۳۲-۷۳۳-۷۳۴-۷۳۵-۷۳۶-۷۳۷-۷۳۸-۷۳۹-۷۴۰-۷۴۱-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۴-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۷-۷۴۸-۷۴۹-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۲-۷۵۳-۷۵۴-۷۵۵-۷۵۶-۷۵۷-۷۵۸-۷۵۹-۷۶۰-۷۶۱-۷۶۲-۷۶۳-۷۶۴-۷۶۵-۷۶۶-۷۶۷-۷۶۸-۷۶۹-۷۷۰-۷۷۱-۷۷۲-۷۷۳-۷۷۴-۷۷۵-۷۷۶-۷۷۷-۷۷۸-۷۷۹-۷۸۰-۷۸۱-۷۸۲-۷۸۳-۷۸۴-۷۸۵-۷۸۶-۷۸۷-۷۸۸-۷۸۹-۷۹۰-۷۹۱-۷۹۲-۷۹۳-۷۹۴-۷۹۵-۷۹۶-۷۹۷-۷۹۸-۷۹۹-۸۰۰-۸۰۱-۸۰۲-۸۰۳-۸۰۴-۸۰۵-۸۰۶-۸۰۷-۸۰۸-۸۰۹-۸۱۰-۸۱۱-۸۱۲-۸۱۳-۸۱۴-۸۱۵-۸۱۶-۸۱۷-۸۱۸-۸۱۹-۸۲۰-۸۲۱-۸۲۲-۸۲۳-۸۲۴-۸۲۵-۸۲۶-۸۲۷-۸۲۸-۸۲۹-۸۳۰-۸۳۱-۸۳۲-۸۳۳-۸۳۴-۸۳۵-۸۳۶-۸۳۷-۸۳۸-۸۳۹-۸۴۰-۸۴۱-۸۴۲-۸۴۳-۸۴۴-۸۴۵-۸۴۶-۸۴۷-۸۴۸-۸۴۹-۸۵۰-۸۵۱-۸۵۲-۸۵۳-۸۵۴-۸۵۵-۸۵۶-۸۵۷-۸۵۸-۸۵۹-۸۶۰-۸۶۱-۸۶۲-۸۶۳-۸۶۴-۸۶۵-۸۶۶-۸۶۷-۸۶۸-۸۶۹-۸۷۰-۸۷۱-۸۷۲-۸۷۳-۸۷۴-۸۷۵-۸۷۶-۸۷۷-۸۷۸-۸۷۹-۸۸۰-۸۸۱-۸۸۲-۸۸۳-۸۸۴-۸۸۵-۸۸۶-۸۸۷-۸۸۸-۸۸۹-۸۹۰-۸۹۱-۸۹۲-۸۹۳-۸۹۴-۸۹۵-۸۹۶-۸۹۷-۸۹۸-۸۹۹-۹۰۰-۹۰۱-۹۰۲-۹۰۳-۹۰۴-۹۰۵-۹۰۶-۹۰۷-۹۰۸-۹۰۹-۹۱۰-۹۱۱-۹۱۲-۹۱۳-۹۱۴-۹۱۵-۹۱۶-۹۱۷-۹۱۸-۹۱۹-۹۲۰-۹۲۱-۹۲۲-۹۲۳-۹۲۴-۹۲۵-۹۲۶-۹۲۷-۹۲۸-۹۲۹-۹۳۰-۹۳۱-۹۳۲-۹۳۳-۹۳۴-۹۳۵-۹۳۶-۹۳۷-۹۳۸-۹۳۹-۹۴۰-۹۴۱-۹۴۲-۹۴۳-۹۴۴-۹۴۵-۹۴۶-۹۴۷-۹۴۸-۹۴۹-۹۵۰-۹۵۱-۹۵۲-۹۵۳-۹۵۴-۹۵۵-۹۵۶-۹۵۷-۹۵۸-۹۵۹-۹۶۰-۹۶۱-۹۶۲-۹۶۳-۹۶۴-۹۶۵-۹۶۶-۹۶۷-۹۶۸-۹۶۹-۹۷۰-۹۷۱-۹۷۲-۹۷۳-۹۷۴-۹۷۵-۹۷۶-۹۷۷-۹۷۸-۹۷۹-۹۸۰-۹۸۱-۹۸۲-۹۸۳-۹۸۴-۹۸۵-۹۸۶-۹۸۷-۹۸۸-۹۸۹-۹۹۰-۹۹۱-۹۹۲-۹۹۳-۹۹۴-۹۹۵-۹۹۶-۹۹۷-۹۹۸-۹۹۹-۱۰۰۰-۱۰۰۱-۱۰۰۲-۱۰۰۳-۱۰۰۴-۱۰۰۵-۱۰۰۶-۱۰۰۷-۱۰۰۸-۱۰۰۹-۱۰۱۰-۱۰۱۱-۱۰۱۲-۱۰۱۳-۱۰۱۴-۱۰۱۵-۱۰۱۶-۱۰۱۷-۱۰۱۸-۱۰۱۹-۱۰۲۰-۱۰۲۱-۱۰۲۲-۱۰۲۳-۱۰۲۴-۱۰۲۵-۱۰۲۶-۱۰۲۷-۱۰۲۸-۱۰۲۹-۱۰۳۰-۱۰۳۱-۱۰۳۲-۱۰۳۳-۱۰۳۴-۱۰۳۵-۱۰۳۶-۱۰۳۷-۱۰۳۸-۱۰۳۹-۱۰۴۰-۱۰۴۱-۱۰۴۲-۱۰۴۳-۱۰۴۴-۱۰۴۵-۱۰۴۶-۱۰۴۷-۱۰۴۸-۱۰۴۹-۱۰۵۰-۱۰۵۱-۱۰۵۲-۱۰۵۳-۱۰۵۴-۱۰۵۵-۱۰۵۶-۱۰۵۷-۱۰۵۸-۱۰۵۹-۱۰۶۰-۱۰۶۱-۱۰۶۲-۱۰۶۳-۱۰۶۴-۱۰۶۵-۱۰۶۶-۱۰۶۷-۱۰۶۸-۱۰۶۹-۱۰۷۰-۱۰۷۱-۱۰۷۲-۱۰۷۳-۱۰۷۴-۱۰۷۵-۱۰۷۶-۱۰۷۷-۱۰۷۸-۱۰۷۹-۱۰۸۰-۱۰۸۱-۱۰۸۲-۱۰۸۳-۱۰۸۴-۱۰۸۵-۱۰۸۶-۱۰۸۷-۱۰۸۸-۱۰۸۹-۱۰۹۰-۱۰۹۱-۱۰۹۲-۱۰۹۳-۱۰۹۴-۱۰۹۵-۱۰۹۶-۱۰۹۷-۱۰۹۸-۱۰۹۹-۱۱۰۰-۱۱۰۱-۱۱۰۲-۱۱۰۳-۱۱۰۴-۱۱۰۵-۱۱۰۶-۱۱۰۷-۱۱۰۸-۱۱۰۹-۱۱۱۰-۱۱۱۱-۱۱۱۲-۱۱۱۳-۱۱۱۴-۱۱۱۵-۱۱۱۶-۱۱۱۷-۱۱۱۸-۱۱۱۹-۱۱۲۰-۱۱۲۱-۱۱۲۲-۱۱۲۳-۱۱۲۴-۱۱۲۵-۱۱۲۶-۱۱۲۷-۱۱۲۸-۱۱۲۹-۱۱۳۰-۱۱۳۱-۱۱۳۲-۱۱۳۳-۱۱۳۴-۱۱۳۵-۱۱۳۶-۱۱۳۷-۱۱۳۸-۱۱۳۹-۱۱۴۰-۱۱۴۱-۱۱۴۲-۱۱۴۳-۱۱۴۴-۱۱۴۵-۱۱۴۶-۱۱۴۷-۱۱۴۸-۱۱۴۹-۱۱۵۰-۱۱۵۱-۱۱۵۲-۱۱۵۳-۱۱۵۴-۱۱۵۵-۱۱۵۶-۱۱۵۷-۱۱۵۸-۱۱۵۹-۱۱۶۰-۱۱۶۱-۱۱۶۲-۱۱۶۳-۱۱۶۴-۱۱۶۵-۱۱۶۶-۱۱۶۷-۱۱۶۸-۱۱۶۹-۱۱۷۰-۱۱۷۱-۱۱۷۲-۱۱۷۳-۱۱۷۴-۱۱۷۵-۱۱۷۶-۱۱۷۷-۱۱۷۸-۱۱۷۹-۱۱۸۰-۱۱۸۱-۱۱۸۲-۱۱۸۳-۱۱۸۴-۱۱۸۵-۱۱۸۶-۱۱۸۷-۱۱۸۸-۱۱۸۹-۱۱۹۰-۱۱۹۱-۱۱۹۲-۱۱۹۳-۱۱۹۴-۱۱۹۵-۱۱۹۶-۱۱۹۷-۱۱۹۸-۱۱۹۹-۱۲۰۰-۱۲۰۱-۱۲۰۲-۱۲۰۳-۱۲۰۴-۱۲۰۵-۱۲۰۶-۱۲۰۷-۱۲۰۸-۱۲۰۹-۱۲۱۰-۱۲۱۱-۱۲۱۲-۱۲۱۳-۱۲۱۴-۱۲۱۵-۱۲۱۶-۱۲۱۷-۱۲۱۸-۱۲۱۹-۱۲۲۰-۱۲۲۱-۱۲۲۲-۱۲۲۳-۱۲۲۴-۱۲۲۵-۱۲۲۶-۱۲۲۷-۱۲۲۸-۱۲۲۹-۱۲۳۰-۱۲۳۱-۱۲۳۲-۱۲۳۳-۱۲۳۴-۱۲۳۵-۱۲۳۶-۱۲۳۷-۱۲۳۸-۱۲۳۹-۱۲۴۰-۱۲۴۱-۱۲۴۲-۱۲۴۳-۱۲۴۴-۱۲۴۵-۱۲۴۶-۱۲۴۷-۱۲۴۸-۱۲۴۹-۱۲۵۰-۱۲۵۱-۱۲۵۲-۱۲۵۳-۱۲۵۴-۱۲۵۵-۱۲۵۶-۱۲۵۷-۱۲۵۸-۱۲۵۹-۱۲۶۰-۱۲۶۱-۱۲۶۲-۱۲۶۳-۱۲۶۴-۱۲۶۵-۱۲۶۶-۱۲۶۷-۱۲۶۸-۱۲۶۹-۱۲۷۰-۱۲۷۱-۱۲۷۲-۱۲۷۳-۱۲۷۴-۱۲۷۵-۱۲۷۶-۱۲۷۷-۱۲۷۸-۱۲۷۹-۱۲۸۰-۱۲۸۱-۱۲۸۲-۱۲۸۳-۱۲۸۴-۱۲۸۵-۱۲۸۶-۱۲۸۷-۱۲۸۸-۱۲۸۹-۱۲۹۰-۱۲۹۱-۱۲۹۲-۱۲۹۳-۱۲۹۴-۱۲۹۵-۱۲۹۶-۱۲۹۷-۱۲۹۸-۱۲۹۹-۱۳۰۰-۱۳۰۱-۱۳۰۲-۱۳۰۳-۱۳۰۴-۱۳۰۵-۱۳۰۶-۱۳۰۷-۱۳۰۸-۱۳۰۹-۱۳۱۰-۱۳۱۱-۱۳۱۲-۱۳۱۳-۱۳۱۴-۱۳۱۵-۱۳۱۶-۱۳۱۷-۱۳۱۸-۱۳۱۹-۱۳۲۰-۱۳۲۱-۱۳۲۲-۱۳۲۳-۱۳۲۴-۱۳۲۵-۱۳۲۶-۱۳۲۷-۱۳۲۸-۱۳۲۹-۱۳۳۰-۱۳۳۱-۱۳۳۲-۱۳۳۳-۱۳۳۴-۱۳۳۵-۱۳۳۶-۱۳۳۷-۱۳۳۸-۱۳۳۹-۱۳۴۰-۱۳۴۱-۱۳۴۲-۱۳۴۳-۱۳۴۴-۱۳۴۵-۱۳۴۶-۱۳۴۷-۱۳۴۸-۱۳۴۹-۱۳۵۰-۱۳۵۱-۱۳۵۲-۱۳۵۳-۱۳۵۴-۱۳۵۵-۱۳۵۶-۱۳۵۷-۱۳۵۸-۱۳۵۹-۱۳۶۰-۱۳۶۱-۱۳۶۲-۱۳۶۳-۱۳۶۴-۱۳۶۵-۱۳۶۶-۱۳۶۷-۱۳۶۸-۱۳۶۹-۱۳۷۰-۱۳۷۱-۱۳۷۲-۱۳۷۳-۱۳۷۴-۱۳۷۵-۱۳۷۶-۱۳۷۷-۱۳۷۸-۱۳۷۹-۱۳۸۰-۱۳۸۱-۱۳۸۲-۱۳۸۳-۱۳۸۴-۱۳۸۵-۱۳۸۶-۱۳۸۷-۱۳۸۸-۱۳۸۹-۱۳۹۰-۱۳۹۱-۱۳۹۲-۱۳۹۳-۱۳۹۴-۱۳۹۵-۱۳۹۶-۱۳۹۷-۱۳۹۸-۱۳۹۹-۱۴۰۰-۱۴۰۱-۱۴۰۲-۱۴۰۳-۱۴۰۴-۱۴۰۵-۱۴۰۶-۱۴۰۷-۱۴۰۸-۱۴۰۹-۱۴۱۰-۱۴۱۱-۱۴۱۲-۱۴۱۳-۱۴۱۴-۱۴۱۵-۱۴۱۶-۱۴۱۷-۱۴۱۸-۱۴۱۹-۱۴۲۰-۱۴۲۱-۱۴۲۲-۱۴۲۳-۱۴۲۴-۱۴۲۵-۱۴۲۶-۱۴۲۷-۱۴۲۸-۱۴۲۹-۱۴۳۰-۱۴۳۱-۱۴۳۲-۱۴۳۳-۱۴۳۴-۱۴۳۵-۱۴۳۶-۱۴۳۷-۱۴۳۸-۱۴۳۹-۱۴۴۰-۱۴۴۱-۱۴۴۲-۱۴۴۳-۱۴۴۴-۱۴۴۵-۱۴۴۶-۱۴۴۷-۱۴۴۸-۱۴۴۹-۱۴۵۰-۱۴۵۱-۱۴۵۲-۱۴۵۳-۱۴۵۴-۱۴۵۵-۱۴۵۶-۱۴۵۷-۱۴۵۸-۱۴۵۹-۱۴۶۰-۱۴۶۱-۱۴۶۲-۱۴۶۳-۱۴۶۴-۱۴۶۵-۱۴۶۶-۱۴۶۷-۱۴۶۸-۱۴۶۹-۱۴۷۰-۱۴۷

کم کر دے اور آخر یہ کثرت و غذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لیے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہیں، اگر یہ طلب و ضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعۃً عالم ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے۔ لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغناء کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے، مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لیے ملاءِ اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہیے اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت ہے اس لیے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ "تقویٰ" سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ
مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ: ۱۸۳)

روزہ کی غرض و غایت تقویٰ ہے، یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے ظالم سے اپنے کو بچانا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لیے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا، لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔

لَتَكْبُرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ (بقرہ: ۲۱۷)

اس مفہوم کی توضیح کے لیے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

رمضان کی حقیقت | یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور عقل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے جس طرح یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے اسی یقین کے ساتھ طب روحانی کا واقعہ کارکتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضان نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے معجزات کا ظہور اس سے کس اوقات میں ہوتا ہے اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرت الی اللہ کرتا ہے اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام و خاسر اور اہل ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے، قرآن مجید میں تیرہ مقام پر سنۃ اللہ کا لفظ آیا ہے، لیکن اس میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے، بعینہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کے اصول قانون ہمارے لیے مرتب کرتی ہیں۔

پیغمبر تاریخ کے انہیں اصول و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیت کو پہنچ کر فیضان نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لیے عالم انسانی سے الگ ہو کر، ملکوتی خصائص میں جلوہ گرہ ہوتا ہے، اسی وقت سے اسکے دل و دماغ میں وحی الہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے کوہ سینا کا پر جلال پیغمبر (حضرت موسیٰ) جب توراہ لینے جاتا ہے تو چالیس شب روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے کوہ سبیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہا۔ اسی طرح فاران کا آتشیں شریعت والا پیغمبر (حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نزول قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ حرام مکہ کے ایک غار میں، ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اسی اثنا میں ناموس اکبر اقرأ یا سبیر رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ كَامْرُؤَهُ جَانْفرا لیکر نمودار ہوتا ہے۔

یہ واقعہ کس ماہ مبارک کا تھا؟

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (بقرہ: ۱۸۳)

رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اُترا۔

یہ کس شب اقدس کی داستان ہے؟

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (دخان: ۱)

ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا۔

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (القدر: ۱)

ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبر امی علیہ السلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لیے دستور نامہ الہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا، قرآن کا حامل اور اس وحی الہی کا مہبط ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکے دوسرے بھوکا اور پیاسا سر بہ زانو تھا اس بنا پر اس ماہ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا روزہ، کسی عبادت کا گاہیکہ و تنہا رہنا (اعتکاف)، نزول وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سربسجود رہنا تمام پیر و ان محمدی کے لیے ضروری تھا کہ

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي
يُحِبِّكُمْ اللَّهُ (ال عمران: ۴)

اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا

تمیں پیار کرے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضان مبارک میں روزہ

۱۰ خرداد ۳۳-۳۸ سے مئی ۲۰۲۱-۲۲ سے صحیح بخاری حدیث بدو الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب نزول وحی میں اور سیرۃ ابن ہشام بدعت میں ہے کہ روایات سے اگرچہ تبصریحی یہ نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غار حرا میں روزہ رکھتے تھے، تاہم قرآن و اشارات سے بکھا جاتا ہے کہ آپ اور عبادت کے ساتھ غار حرا میں روزہ بھی رکھتے تھے جیسا کہ بخاری (بدو الوحی) اور سیرت ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ اندون میں تخت اور اعتکاف کرتے تھے جس کا ایک جزء روزہ ہے، آج کل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی اس قرآن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ اندون روزہ رکھتے تھے۔ دیکھو خضریٰ کی التشریح اسلامی صفحہ ۲۰ صفحہ ۴

کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لیے اس ماہ اقدس میں بقدر امکان انہیں حالات و جذبات میں متکلیف ہونا چاہیے، جس میں وہ حامل قرآن متکلیف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو، یہ جذبات و حالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکرگزاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

فرضیت صیام کا مناسب موقع سلسلہ | اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرف عام میں فاقہ کشی کا نام ہے اور عرب کو ملک کی اقتصاد کی حالت کی وجہ سے اکثر یہ سعادت نصیب ہو جایا کرتی ہے، ظہور اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا، اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقہ کسب معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا، جن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی، تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لیے تھے اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لیے موزوں ہو سکتا تھا، نماز و حج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا وہ ایک خاموش طریقہ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا لیکن اسلام نے عبادت کو امراض روحانی کی دوا قرار دیا ہے جن کا استعمال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب امراض روحانی پیدا ہو جاتے ہیں، یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے، قوائے شہوانیہ اور زخارف دنیا کی شیفٹنگ اور لذات حسیہ کے انہماک و توغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے، مکہ میں یہ تمام ساز و سامان مفقود تھے بلکہ خود کفار کے جو رسوم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا اس لیے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت تھی پیش نہیں آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لانے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی، انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو بوجہ کفار سے بے نیاز کر دیا فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وقت آ گیا یا عنقریب آئیگا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آکر ان کو اپنا فریضہ بنانے اس لیے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا جن میں مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی اور وہ پرہیز روزہ تھا جو سلسلہ میں فرض ہوا اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے جو بعض نادانوں کو ہوا ہے کہ چونکہ آماز اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس لیے ان کو روزہ کا نوگر کیا گیا، حالانکہ اصول اسلام کی رو سے فاقہ مستوں کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے، سکیم سیروں کیلئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے، علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا اس لیے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا، جب کہ لوگ توحید، نماز اور احکام قرآنی کے نوگر ہو چکے تھے، اس لیے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لیے موزوں تھا۔

ایام روزہ کی تحدید | روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بعد دوا ہی ہونا چاہیے تھا اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا، تو یہ ایک غیر طبیعی علاج ہوتا، اور مسلمانوں کی جسمانی جہد و جہد کا خاتمہ ہو جاتا اور ان کی شکستگی مزاج مٹ جاتی جو عبادت کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں نہ تاریخ ابن جریر طبری واقعات سلسلہ و رذقانی برماہ سب جلد اول ص ۴۰، مفہوم زاد المعاد ابن قیم جلد اول ص ۱۶۰ مصر

دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا اس لیے اسلام نے روزہ کے لیے سال کے ۱۲ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ ان کے لیے مقرر کیا اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی تاکہ تمام افراد امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لیے وہی زمانہ موزوں تھا جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا، یعنی رمضان چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گزارا اور آج تک کل امت محمدیہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے، اس لیے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو سکے اور اس کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ: ۱۸۳) اسے ایمان والو روزہ تم پر فرض کیا گیا ہے۔
 اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا، بلکہ
 كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ: ۱۸۳) جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔
 اب بھی مدت نہیں بتائی گئی اس کے بعد فرمایا گیا
 أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ (بقرہ: ۱۸۳) چند گئے ہوئے دن۔

مدت کی تعیین اب بھی نہیں البتہ اس بلینغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے اور فرمایا چند گئے ہوئے دن "اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر شروع کر دیا گیا، تاکہ طبیعت متوجہ رہے۔

فَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ (بقرہ: ۱۸۳) تو جو بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی۔

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے کہ اگر خاص زمانہ ہوتا تو یہ کہنا بیکار ہوتا تاکہ تم بیمار یا مسافر ہوں تو دوسرے دنوں میں رکھو، نیز یہ بھی اشارہ پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے وہ گئے ہوئے مقرر ہوں گے۔ ورنہ صَعْدُ وُذَاتٍ (گئے ہوئے) اور عِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر وَلْيَكْتُمُوا الْعِدَّةَ (تاکہ تم شمار پورا کر لو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی۔
 وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ تَطَعًا (بقرہ: ۱۸۳) اور جو بيشکل روزہ رکھ سکتا ہو، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے۔

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے۔
 فَسَنَ تَطْوَعُ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ طَوْ (تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ بہتر ہے
 اَنْ تَصُومُوا خَيْرًا لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
 تَعْلَمُوْنَ (بقرہ: ۱۸۳) ہے اگر تم جانو۔

ان آیتوں میں دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی۔ اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گئے ہونے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے، کہ وہ ایک مہینہ ہے اور جس کو ہلکا کر کے دکھانے کے لیے فرمایا گیا تھا کہ **أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ** (چند گئے ہونے دن) ظاہر ہے کہ سال کے تین سو ساٹھ دنوں میں انیس اور تیس دن کے روزے چند گنتی کے دن تو نہیں ہی، بہر حال رمضان کو ماہِ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی، فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ
الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ
مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ (بقرہ: ۲۳)

وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور بدایت اور حق و باطل کی تیز کی دلیلیں ہیں۔

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں فرمایا جائے کہ ان چند دنوں کے روزے اسی رمضان میں جس کی یہ عظمت ہے تم پر فرض کیے گئے ارشاد ہوا۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ: ۲۳) تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزے رکھے۔

اب پورے ماہ رمضان کے روزوں کی تعیین و تحدید اور ایاماً معدودات کی تشریح ہو گئی، عربی کا محاورہ ہے کہ جو ظرف زمان ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرف زمانہ کو محیط ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے بیسے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے **صَامَ شَهْرًا** اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے **صَامَ سَنَةً** (سال بھر روزہ رکھا) اس سے ثابت ہوا کہ اس آیت پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے اور چونکہ لفظ "شہر" یعنی "مہینہ" کہا گیا ہے، اس لیے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری مہینہ جس کا عرب میں رواج تھا، اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوتے ہیں، جیسی روایت

لہ عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اس کو چاہیے کہ **أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ** کو جو تعداد میں سینکڑوں ہیں، زیادہ سے زیادہ نو لڑائیوں میں محدود کر دے اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں دین کے ہزار ہا انقلاب کو **أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ** کہے (ابراہیم: ۱) انکو نو تک کے انقلابات عالم میں محدود کر دے، یمن سے شام تک کے سرسبز راستے کو جو مہینوں میں طے ہوتے تھے اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند تیس فرسوں سے **أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ** (سبا: ۲) اور فی **الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ** (گذرے ہوئے دن) جس کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی مری پر **بَلَدَكَ الْأَيَّامُ مَرْتَدًا** وَلَهَا بَيْنَ النَّاسِ كَوْمَانِ کے برسوں اور صدیوں پر کیلے، وہ نو دن زیادہ نہ بڑھ سکیں، جمع قلت و کثرت کا یہ قلمند وہ بھی کی نہیں، بلکہ عربی ان الفاظ کے لیے ہے جن کی جمع قلت و کثرت دونوں متعلق ہیں، ایام کا لفظ ان میں نہیں اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہے اور وہ ایام ہے جو تھلیل کے بعد ایام بولا جاتا ہے، سن کے لیے دیکھو معنی شرح کافیہ جلد دوم بحث جمع کثر اور لسان العرب لفظ یوم کے تفصیل کے لیے دیکھو معنی جلد اول مفعول فیہ ظرف زمان ص ۱۶۲ مطبعہ مکتبہ المدینہ ۱۸۶۸ء جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ثابت ہے **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَيَّامِ الَّتِي نَزَّلْنَا فِيهَا الْقُرْآنَ** (بقرہ: ۲۳) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں (پہلی رات کے چاندوں (ہلال) کے بارے میں، کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو وقت اور جرج کی تاریخ بتانے کے لیے ہے اس

ہو، وہی ماہِ صیام پر بھی عداوق آئے گا، جیسا کہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ تمام صحابہ کرام، خلفائے راشدین اور جمیع فرق اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے اور احادیث صحیحہ میں اس کی پوری تقریحات مذکور ہیں۔

ایک نکتہ | قرآن پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم **ان الفاظ میں** دیا ہے۔
فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ: ۲۳) تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے۔

لفظ شہد کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں جو اس ماہِ صیام میں موجود اور حاضر ہو، اس ماہِ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر رہنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ماہِ صیام آئے، اور شخص غیر حاضر ہو، یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہِ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے، شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہِ صیام کا وہ دن گذر نہ ہو، یہ صورت ان قطعاً ارغی میں پیش آئے گی، جہاں شب و روز کا وہ نظام موجود ہو جو باقی متمدن دنیا میں ہے، مثلاً جن مقامات پر کسی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں کہ وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں، وہاں گزروں کے مسلمان چاہیں، تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور کھولیں (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح میں ہے ثابت ہے۔

لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت سے کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بار دہنایا ہے، تاکہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہو سکتی تھی وہ دم کی برداشت سے کم ہو جائے چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

معذورین | جو لوگ حقیقت میں اس فریضہ صیام کے ادا کرنے سے معذور ہوں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اسی لیے ارشاد ہے :-

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ
بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ: ۲۳)

اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو رخصت عطا فرمائی ہے کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کر لے۔

بیمار کے دو معنی ہیں، یا تو وہ فعلاً بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متقی حبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزے رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا، یا بار بار کے تجربوں کے بعد شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے لیے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کر اور اسکے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے، فرمایا :-

لہ پہلے اور دوسرے ایشین میں اس موقع پر ان لوگوں کے لیے جو اتنی مدت کے دن میں روزہ کے بجائے کفارہ کرنے کی اجازت لکھی گئی تھی وہ میری غلطی تھی جس سے میں ۳- رجوع کرتا ہوں۔ س :-

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (بقرہ: ۲۳)

ہی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ ہی کے عہد سے اختلاف ہے، وہ آیت یہ ہے: وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ (بقرہ: ۲۳) اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت ہو نہ زیادہ

طعام مسکین (بقرہ: ۲۳) کریں، ایک مسکین کا کھانا
۱۔ بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے ان روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں، چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روزہ کی جگہ دیں، رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔

۲۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یطیقون کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیہ ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مہینے روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے (فوز البکیر باب ما صح منسوخ)

۳۔ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے، اور یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جو روزوں سے معذور ہوں جیسے اور بڑھے اور حاملہ۔

اصل یہ ہے کہ لفظ یطیقون کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے، اطاعت کو وسیع کے معنی میں سمجھا گیا ہے اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ ایک مسکین کا کھانا دیں، تو اس ترجمہ کی مطابقت یا تو نسخ ماننا پڑے گا اور یا آجکل کے بعض آزاد خیالوں کی مانے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں، وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ دیکر روزہ سے بچ سکتے ہیں، حالانکہ یہ صریح غلط ہے اس کے معنی تو ہوں گے کہ غزباً روزے رکھیں اور امر اور فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہو جائیں، ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روٹ نہیں رکھی گئی ہے اور اسلام کا تو اثر عمل اس کے بالکل خلاف ہے اور آیت مابعد کہ فَمَنْ كَانَ مِنَ الشَّهْرِ فَلْيَصُمْهُ (جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزے رکھے) کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاعت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں، اس لیے یطیقون کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو مشکل روزے رکھ سکتے ہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں۔

۱۔ اطاعت طاقت کا باب افعال سے مصدر اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا، فعل بنانے کے لیے باب افعال مستعمل ہے اور طاقت کے معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں، والطوق الطاقۃ ای اقصی غایت۔ وهو اسم لمقدار ما يمكن ان يفعله بمشقة منه۔ طرق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت و مشکل کے ساتھ کر سکے۔ اطاعت کے اس معنی کی تائید

اب روزہ کے سلسلے میں معذوروں کی دو صورتیں ہوں گی، ایک یہ کہ یہ عذر ہنگامی اور عارضی ہو جیسے مرض یا خوف مرض یا سفر تو ان کے لیے یہ آیت ہے۔

القیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے، قرآن پاک میں ہے :-

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ (بقرہ: ۲۰۱)

اے ہمارے پروردگار اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جسکی ہم کو طاقت نہیں ہے، جس کی ہم کو طاقت نہیں ہے، یعنی جس کو ہم کوری نہیں سکتے۔ کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا، فرمایا :-

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ: ۲۰۱)

اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا، لیکن اس کا جو اس کی وسعت میں ہو۔

اس لیے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالے جس کو ہم اٹھا ہی نہیں سکتے ہوں، صحیح نہ ہوگا، بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونیکے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم مشکل اٹھا سکتے ہوں۔ اسی طرح طاقت کے لشکر یوں کہ یہ کہنا کہ لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ (بقرہ: ۲۳۱) آج ہم میں حالت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بہ مشکل مقابلہ کر سکتے ہیں حدیثوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔

عَنْ ابْنِ جَبْرِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ طَعَامِ مَسْكِينٍ قَالَ كَانَتْ رَحْمَةً لِلشَّيْخِ الْكَبِيرِ وَالْمَرْأَةِ الْكَبِيرَةِ وَهِيَ يُطِيقَانِ الصَّيَامَ إِنْ يَفْطَرُوا وَيُطْعَمَا مَكَانَ كُلِّ يَوْمٍ مَسْكِينًا۔ ابن حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بہ مشکل رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے، فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے اجازت ہے کہ وہ دونوں بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، اور وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ بطیقان الصيام کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی، اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا ایڈیشن لکھتے وقت دوسرے علماء کی تائید مجھے نہیں مل سکی تھی، اب بحمد اللہ یہ تائید بھی مل گئی ہے۔ سرآمد علمائے اہل حدیث شارح عون المعبود، شرح ابی داؤد میں اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

لکن مع شدة التعب ومشقة عظيمة، اسی طرح محدثین حنفیہ کے سب سے وسیع النظر شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد تلامذہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی یہ تحقیق تھی، فالجملہ لہ۔ ان وجوہ سے دلی الذین یطیقون فدیة کا ترجمہ یہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں، بلکہ یہ ہوگا، کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں :-

فَإِنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (بقرہ:) میں گنتی ہے۔

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھے، اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گنتی دوسرے مناسب وقت قضا رکھ کر پوری کر لے ایمیں حاملہ اور مرضہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہوگی۔ اگر حاملہ یا مرضہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری... کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے، اور اس عذر کے دور ہونے کے بعد قضا رکھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو اور ناقابل ازالہ ہو، جیسے کوئی دائم المرضی ہو، بہت ہی کمزور ہو اور بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتا ہو، تو وہ روزہ قضا کرے، اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دے دے اس کے لیے یہ آیت ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامَ مِسْكِينٍ اور ان پر جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب بہ مشکل روزہ پرقادر ہو اس کو فدیہ کی اجازت ہے تو جو باسکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بلا دلی فدیہ کی اجازت ہوگی، لا یكلف اللہ نفسا الا وسعاً۔

روزہ پرائعراض اور اس کا جواب علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی جو عام عبادات و پرستش کی غرض وغایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لیے جسمانی رحمت کثی ہے اور ان غلط فہمیوں کے لیے دیگر مذاہب میں گولغز شکا میں موجود ہیں، چنانچہ جوگیوں اور یسینوں میں روزہ کی غیر معمولی مذت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصلاح میں روزہ کے لیے نفس کو دکھ دینے کی اصطلاح جاری ہے، چنانچہ توراہ میں روزہ کے لیے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے، سفر الاجار (۱۶-۲۹) میں ہے، یہ تمہارے لیے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو، خواہ پر دیسی جس کی بود و باش تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے:

توراة کے سفر العدد (۲۹-۷) میں ہے:

اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو، اور کچھ کام نہ کرو۔ یہ اصطلاح توراہ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ صوم ہے، صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں جہاں مسلمانوں کو روزہ کا حکم دیا ہے، وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیے ہیں۔

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا

خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں

يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ: ۲۳) چاہتا۔ اسلام کا عام قانون ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا اَلْوُسْرًا (بقرہ: ۲۹) خدا کسی جان کو اسکی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:-

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اَصْرَهُمْ وَالْأَعْقَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف: ۱۹)

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات اور احکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے اور اسی لیے اسلام نے روزہ کی ان سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں، بتدریج کم کر دیا۔

روزہ میں اصلاحات اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور ایسے جو سہولتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں

۱۔ سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے ان میں اکثر روزہ صرف پیروں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لیے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لیے روزہ ہے، یونانیوں میں صرف عورتوں کے لیے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروان مذہب کے لیے برابر طور سے ضروری ہے۔

اسلام میں پیشوا اور غیر پیشوا، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے تمام پیروں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ: ۲۳) اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال میں روزہ کی تو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، ان میں تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں تو یا تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لیے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لیے آرام دہ ہیں، اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس سے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے اور اس بنا پر اس کی سختی نرمی بدلتی رہتی ہے۔

۳۔ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص و استثناء نظر سے نہیں گذری، توراہ میں تو یقیناً مذکور نہیں، بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو

وہ کٹ جائے گا یا قتل ہو جائے گا، بلکہ یہ ہے کہ اس پر دیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گوہر ہودی نہیں مگر یہودیوں کے پاس آکر رہا ہو، لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا، بچے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایام حمل میں و رضاعت میں اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں، بڈھے، بیمار اور سفر پر مستثنیٰ ہیں، مگر وراثت خاص جو روزہ پر فطرہ قادر نہیں مستثنیٰ ہیں، بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں، اور جو دائمی طور سے معذور ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ طَعَامٍ مِّسْكِينَ (بقرہ: ۲۳)

اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھ لے اور وہ لوگ جو بر مشکل روزے رکھ سکتے ہوں ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَضَعَهُ عَنِ الْحَامِلِ وَالْمَرْضِعِ الصَّوْمِ،

حضرت انس سے مروی ہے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خد نے حاملہ اور دودھ پانیا والی سے روزہ اتار لیا۔

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے اگر انکو اپنی یا بچہ کی جان کا خطرہ ہو تو روزہ قضا کر کے رفع عذر کے بعد قضا رکھیں۔ ۴۔ اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا ناقہ تھا یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام میں اس میں بھی توسعہ اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات میں گوہر ہرم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

۵۔ جنیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صبح سے شام تک کا روزہ قرار دیا۔

شَهْرًا تَبَوَّأُوا الْقِيَامَةَ إِلَى الْبَيْتِ (بقرہ: ۲۳)

۶۔ یہودیوں کے ہاں یہ روزہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے سو کھا لیتے، سو جانے کے بعد کھانا، پھر ناجائز تھا، ابتداء اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ رمضان کا مہینہ تھا ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا تیار نہیں ہوا تھا انکی بیوی کھانا پکا رہی تھی وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لیکر آئیں وہ سوچے تھے اس لیے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے دن پھر روزہ کا دن تھا ان کو عیش آگیا اس پر یہ آیت اتری :-

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَسْبَأَ بَيْنَ لَكُمْ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ: ۱۸۳)

اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے متوازن ہو جائے۔

۷۔ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے، اس لیے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ مانعت محدود کر دی اور رات کو اجازت دیدی۔

أَجَلٌ لَّكُمْ لَيْلَةَ الْقِيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِهِنَّ عِلْمٌ اللَّهُ أَعْلَمُ كُنْتُمْ تَخْلَوْنَ أَنْفُسَكُمْ فَجَاءَ بِشْرُكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوا وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ (بقرہ: ۲۳)

روزہ کی شب میں بیویوں سے مقارنت تمہارے لیے حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم انکی، خدا جانتا ہے کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے تو اس نے معاف کیا، اب بیویوں سے جا ملو، اور خدا نے تمہارے معذرتیں جو کچھ رکھ لے (یعنی اولاد) اسکی تلاش کرو۔

۸۔ بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں معاف ہے اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ مار کچھ کھاپی لے، یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ ابْنَ مَسْعُودٍ قَالَ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَضَعَهُ عَنِ الْحَامِلِ وَالْمَرْضِعِ الصَّوْمِ،

ابو ہریرہ سے مروی ہے، جو بھول کر کھائے یا پے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، کہ یہ تو خدا کی ہدیٰ تھی،

۹۔ اسی طرح ان افعال سے جو گوہر روزہ کے منافی ہیں، لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوئے، بلا ارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا۔

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَفْطَرُ فَا نَصَا هُوَ رِزْقُ اللَّهِ (ترمذی)

پیغمبر خدا نے فرمایا جسکو بھولے ہو گئی یا سونے میں غسل کی ضرورت پیش آگئی، اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۱۰۔ یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے، اس لیے روزہ کی حالت میں وہ زیب و زینت نہیں کرتے تھے، اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے، حضرت عیسیٰ نے فرمایا :-

پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ او اس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں، کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا، اور منہ دھو، تاکہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، آشکارہ تجھے بدلہ دے (متی ۶-۱۶)

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے اس لیے روزہ کی حالت میں سر میں تیل لگانا، سر مرڈانا، خوشبو ملنا اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ لہ قے ہونے کی فقہ حنفیہ میں کئی صورتیں ہیں ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں، ۱۲۔

یہ عرض بھی ہے کہ روزہ دار، ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نائش کر کے ریاضی گرفتار نہ ہو، اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے بلکہ سہمی، خوشی، رضامندی اور مسرت ظاہر ہو۔

۱۱۔ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تمقن سے باز رکھا جائے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے ان کے علاوہ کبھی کبھی رات کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے لیکن دوسرے روزوں کی طرف استجاب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً مانفت فرمائی۔ بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا :-

ایک مٹلی انی ابیت یطعمی ربی ویسقی۔
تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے (یعنی روحانی غذا)

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کیے، جب مہینہ گزر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا، کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔

روزہ کے مقاصد اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تعلیم ربانی، محض حکم کے طور پر نہیں ہے بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے، اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چارگانہ ستونوں پر قائم ہے، اور ان مصلحتوں اور منفعتوں کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ لہامی نے ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے، چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی لکھا گیا ہے تین مختصر فقروں میں بیان کر دیے ہیں۔

(۱) لِتُكْبَرُوا لِلَّهِ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ لَقَدْ كُنْتُمْ كَافِرًا ۖ (بقرہ: ۲۳) تاکہ خدا جو تم کو ہدایت کی ہے سچ اسکی بڑائی اور عظمت ظاہر ہو۔

(۲) وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (بقرہ: ۲۳) تاکہ اس ہدایت کے پلنے پر تم خدا کا شکر کرو۔

(۳) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ: ۲۳) تاکہ تم پر ہیزگار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)۔

اوپر گزر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی اور تابہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انہوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا، یہاں تک کہ وہ مکالمہ الہی سے سرفراز ہوئے اور پیغام ربانی نے ان پر نزول کیا، حضرت موسیٰ نے چالیس روز اسی طرح بسر کیے، تہ توراہ کی لوہیں ان کو سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰ نے بھی چالیس روز اسی طرح گزارے، تہ حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے

ابلا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں ایک مہینہ یعنی تیس دن معروف عبادت رہے، اس کے بعد فیضان الہی کا نور اس غار کے دہانے سے طلوع ہوا۔

حامل قرآن کی پیروی اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان مشرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے، یہودی بھی حضرت موسیٰ کی پیروی میں ۴۰ دنوں کا روزہ منا اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض کھتے تھے، عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰ کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہیے تھا مگر انہوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰ کے اور احکام و سنن کی اتباع نہیں کی اس کی بھی نگی، اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی میں چند دن اسی طرح گزاریں، چنانچہ فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ
مِن قَبْلِكُمْ (بقرہ: ۲۳)

اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر دان کے رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکر یہ ہیں، روزہ فرض کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا۔
دین الہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکر یہ ہے کہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، شکر یہ ہے، اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتاب الہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایات روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ، اور ظلمات سے نورانی بنایا، اپنی و ذلت کے عیش غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے ان کی جمالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، جس نے ان کی قسمتوں کے پائے الٹ دیے اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو مملو کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشق خاک کو ہدوش ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے :-

وَلِتُكْبَرُوا لِلَّهِ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

اور یہ رمضان کا روزہ، اس لیے فرض ہوا تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ (بقرہ: ۲۳)

اس ہدایت ربانی اور کتاب الہی کے عطیہ پر شکر گزار ہی کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عید گاہوں میں جاتے، اور خوشی و مسرت کے دلولوں کے ساتھ عید کا وہ گانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

تقویٰ | روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرمایا گیا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ: ۱۸۳)

اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

۱- تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی ہے اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے روزہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لیے بہترین چیز ہے۔

۲- اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہیے کہ دن رات میں ایک وقت کھانا کھائے اور ہو سکے تو ایک وقت کھانا اپنے فاقہ زدہ، محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے، ان تمام احکام پر نظر ڈالیے جو نذیر اور کفارہ سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع میں روزہ کا بدلہ غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں، ایسے لوگ جو فطرہ کمزور یا دائم المرصن یا بہت بڑھے ہیں اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں انکو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے :

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ
طَعَامٌ مِّسْكِينَ (بقرہ: ۲۱۷)

اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔

جج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے۔
فِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ
أَوْ نُسُكٍ (بقرہ: ۲۳۰)

تو روزہ - نیسرات یا قربانی فدیہ دے۔

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں جس کو تمتع کہتے ہیں، ان پر قربانی واجب ہے جو غریبوں ہی میں تقسیم کی جاتی ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو -

فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ
إِذَا رَجَعْتُمْ (بقرہ: ۲۳۱)

تو دس روزے رکھیں، تین حج میں اور سات گھر آکر۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجہ کھریا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے جو منی لیا کر ذبح کی جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو -

أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامٌ مِّسْكِينَ أَوْ عَدْلٌ
ذَلِكَ صِيَامًا دَامَهُ (۱۱۳)

یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے،

فَصِيَامٌ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ (مانہ: ۱۱۴)

تو تین دن کے روزے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو،

فَصِيَامٌ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (مجادلہ: ۱۰)

تو دو مہینے متواتر روزہ۔

اور یہ بھی ممکن نہ ہو،

فَأُطْعِمُوا سِتِّينَ مِسْكِينًا (مجادلہ: ۱۰)

تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت، صدقہ و خیرات، غریبوں کے کھلانے، بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے۔

۳- روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کسی اذیت، اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت اس کو اپنے عزیز اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے، جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی، اور خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا، بقول حافظ ابن قیم سوز جگر کے سمجھنے کے لیے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت با درواں کی طرح ہوتی تھی، اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے دل اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت اور انکو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

۴- انسان کو کتنا ہی نعمت و ناز کے گودوں میں پلا ہو، اور مال و دولت سے مالا مال ہوتا ہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی، اور سختیوں کا نوگر بنائے، جہاد کے ہر متوقع میدان کے لیے، بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر و ضبط سے اپنے آپ کو آشکار کھنے کی ضرورت ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لیے ہر وقت تیار رہے، اور دنیا کی کشمکش جہد و جدوجہد، سختی و محنت کا پوری

طرح مقابلہ کر کے، اسی لیے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

۵۔ جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اس سے کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے، طب کے تجربے اور مشاہدے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لیے ضروری ہے، مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے۔ طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا مانگہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہیں، مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جہانِ فضلہ کی تحفیف کے لیے فرضا روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں، ان کو فاقی تجربہ ہو گا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار و سحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لیے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جہانی علاج بھی ہے۔

۶۔ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا بند کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جاسکتا ہے، اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

۷۔ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لیے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے، جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تیز و معدی کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے۔

۸۔ روزہ بہت سے گناہوں سے انسانوں کو محفوظ رکھتا ہے اس لیے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی کئی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے۔ روایہ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنانچہ رقم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلا۔ اگر اس کی سکت نہ ہو،

فَصِيَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ بِذَلِكَ الْكْفَارَةِ
أَيَّمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا
أَيْصَانَكُمْ (مائدہ: ۱۲)

تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جاسکے تو،

أَوْعَدُ ذَلِكَ صِيَا كَالْيَدِ وَقَفْ
وَبَالَ أَمْرًا عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفْ

یا اس کے برابر روزہ، تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا چکھے، اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا۔

(مائدہ: ۱۳)

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خون بہا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو،

فَصِيَا فُرْشَيْنِ صَتَّابِعَيْنِ تَوْبَةً
فَسَنَ اللَّهُ (نساء: ۱۳)

تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لیے دو مہینے کے لگانا روزے کے۔

اس سے انداز ہو گا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

۹۔ اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی، روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قوی کو، تھوڑی دیر کے لیے سرد کر دیتا ہے، کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ، تنگم سیر معنہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں، ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے۔ یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قوی کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیت خاطر، یہ جذبات کا سکون ہوتا

ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر، اور اپنے لیے پرندامت اور پشیمانی اور خدا تعالیٰ کی باریک سے ڈر کے لیے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لیے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے، اور نیکی اور نیک کاموں کے لیے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں تراویح ہے اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے، اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گو سرا بہار تھی، لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔

۱۰۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ گویا روزہ رکھا ہی نہیں گیا، یا یوں کہنا چاہیے کہ جسم کا روزہ ہو گیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا، اسی کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا چھوڑ دے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے

۱۔ صحیح بخاری باب الوجہی جلد اول صفحہ ۳۲ صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۲۵۵ و ترمذی باب الصوم ص ۶۳ و ابوداؤد، صوم ص ۲۳۶ و ابن ماجہ صوم ص ۱۲۲

فرمایا، روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ لغو اور فحش باتیں نہ کہے، اور نہ جہالت (عقل سے) کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو، اور گالی بھی دے، تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں، بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کر دو" صحابہ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے، فرمایا "بھوٹ اور غیبت سے" چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

۱۱۔ تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لیے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

۱۲۔ اسی اخلاص اور بے ریا بی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لیے اپنا کھانا پینا اور لذت کو چھوڑتا ہے، اس لیے،

الصوم لم واننا اجزی بھ روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لیے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے،

اِنَّمَا يُؤْتِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (زمر)

صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لیے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

۱۳۔ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے اسی لیے مشکلات کے حل کرنے کے لیے دعا اور صبر کرنا کی خاص ہدایت ہوئی ہے۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (بقرہ: ۵)

مدد حاصل کرو۔

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیونکہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لیے اس کی مہارت اور مشق کے لیے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لیے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی کیے گئے ہیں۔

۱۴۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنة میں ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی گناہوں کی معافی اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے :-

۱۔ صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲۵۲ صحیح مسلم صوم جلد ۱ ص ۳۲۴ موطا امام مالک صوم ۹۷، نسائی ۲۵۵ (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْحَافِظِينَ
فِرْجَانَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ
اللَّهُ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ
اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا
عَظِيمًا (احزاب: ۵)

اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی
شریکوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور
حفاظت کرنے والی عورتیں، اور خدا کو زیادہ یاد
کرنے والے مرد اور زیادہ یاد کرنے والی عورتیں ان کے
لیے اللہ نے تیار رکھی ہے، معافی اور بڑی مزدوری۔

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے، اسی طرح ہمارے روحانی
گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

ۛ

ح

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ (آل عمران: ۱۰)

حج اسلام کی عبادت کا جو تھاکرن اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے اس کے لفظی معنی قصد اور ارادہ کے ہیں، اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد گھیر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل، خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور چھوٹی پٹیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی، پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی اس سے ترقی کر کے اس نے ایک قوم اور ایک ملک کا قالب اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی۔

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت ابراہیم قلیل کے عہد میں ایک خاص خاندان کا تبلیغی مستقر بنا، پھر حضرت اسماعیل کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور چھوٹی پٹیوں کی مختصر آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کر لی، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا۔

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصورانہ احاطہ میں دو خاص باغلیت مکان بنائے جاتے تھے ایک اس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ، اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا ہے، عموماً ہر آبادی کسی کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اسکی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی، اور اسی محافظ دیوتا یا ستارہ کی نماں پوجا ہوتی تھی، اسکے بعد معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا، نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیاداریں اسیں جمع ہوتی تھیں، اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا، جہاں کلانیوں کی آبادی اور حکومت تھی یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی، حضرت ابراہیم نے نبوت پاکر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، انکے خاندان اور قوم کے لوگوں نے انکو اسکے لیے تکلیفیں دیں اور بالآخر انکو اپنا آبائی وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی، یہ تمام وہ مقامات تھے جن میں سام کی

لہ توراة اور بابل کلان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ملیں گے اور میری تصنیف ارض القرآن میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں

اولاد پہلی ہوئی تھی اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں یکسوس یا چرواہے (بدو) باؤٹا ہوں کے نام سے حکمران تھیں۔

حضرت ابراہیم نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رخ کیا، اور بحریت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا، اپنے بیٹے حضرت اسحاق کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بکھر کر ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جسکو انکے نسب سے آج تک یمن کہتے ہیں اور اس آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسماعیل کی سکونت مقرر کی، یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی جس پر سے مصر و شام حجاز و یمن اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جاينوالے تاجروں، سوداگروں اور قافلوں کا اتنا لگا رہتا تھا۔

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقصد تھے ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے لئے میں تکلیف نہ ہو اور ساتھ ہی وہ بھی سوداگری میں ہر آسانی شریک ہو سکے اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لیے قوموں کے یہ گزرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق و شام کی تجارتی قوموں کے حدود سے مشہور بت برست اور ستارہ پرست تھیں، علیحدہ رہ کر لوگوں میں دین حق کو پھیلا سکتی تھی۔

بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی خطرہ نظر آتا وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے، چنانچہ توراة کتاب پیدائش میں ان کی تین قربان گاہیں یا خدا کا گھر بنانے کے واقعات مذکور ہیں۔

تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا، اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پتھر اور اسی اس کے پورب تھا، اور وہاں اس نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا۔ (۱۲-۱۴-۸) اس کے بعد ہے:

اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت اللہ میں اس مقام تک پہنچا جہاں اس نے شروا میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیم نے خدا کا نام لیا (۱۳-۳) پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا، اور حکم ہوا، "اٹھ اور اس ملک کے طول و عرض میں پھر کہ میں اسے تجھ کو دوں گا، اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور مصر کے بلوطوں میں جو جبروں میں ہیں جا رہا، اور وہاں ایک قربان گاہ بنائی (۱۳-۱۴-۱۸)

لہ میری تصنیف ارض القرآن جلد اول میں اس پر مفصل بحث ہے

اسی قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، اور حضرت موسیٰ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان نے بیت المقدس کی تعمیر کی، جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا، حضرت اسحاق کے حال میں ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی:

اور اس نے وہاں ذبح بنایا، اور خدا کا نام لیا، اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا، اور وہاں اسحاق کے

لوگوں نے کھواں کھودا۔ (پیدائش ۲۶-۲۵)

حضرت یعقوب کو جہاں مقدس روایا ہوئی، وہاں،

اور یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا کعبہ کیا تھا، کھڑا کیا اور اس کے سرے پر تیل

ڈالا، اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا، اور یہ پتھر جو زمین نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہو گا، اور سب

میں سے جو توجھے دے گا دسواں حصہ عشرت تجھے (خدا کو) دوں گا۔ (۲۸-۱۸-۲۷)

حضرت موسیٰ کو حکم ہوتا ہے:

اور اگر تو میرے لیے پتھر کی قربان گاہ بنائے، تو تیرے ہونے پتھر کی مت بناؤ، کیونکہ اگر تو اس کے

لیے اوزار لگائے گا تو اسے ناپاک کرے گا، اور تو میری قربان گاہ پر سیرھی سے ہرگز مت چڑھو، تاکہ تیری

برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو۔ (خروج ۲۰-۲۵-۲۶)

حضرت موسیٰ نے خدا کے حکم کے بموجب:

ارد پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں کے لیے بارہ ستون بنائے، اور سلامتی

کے ذبیحہ جلیوں سے خداوند کے لیے ذبح کیے اور موسیٰ نے آدھا خون لے کے ہانسون میں رکھا،

اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا۔ (خروج ۲۳، ۳۰، ۳۱)

اور پر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح، قربان گاہ) بتایا گیا ہے اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ، اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں کعبہ مسجد حرام، اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔

حضرت اسماعیل کی قربانی اور اس کی شرائط اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب حضرت ابراہیم نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراہ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسماعیل تھے، اور یہ بحث بھی وہیں گزر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراہ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کردہ جانوروں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور وہ جانور اسکی طرف سے قربانی کیے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کیے جاتے تھے وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب ان کا سر منڈا جاتا تھا جو قربانی یا نذر پیش کی جاتی تھی وہ پہلے قربان گاہ پر لٹائی یا پھرائی جاتی تھی، اسکے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی۔

ملت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے | توراہ اور قرآن پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملت ابراہیمی کی اصل بنیاد قربانی تھی، اور یہی قربانی حضرت ابراہیم کی پختہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی، اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے سائنس کے سبب سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی، توراہ کی کتاب پیدائش میں ہے (۲۲-۱۶-۱۸)

خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا، اور اپنا بیٹا لیا، اپنا اکلوتا بیٹا درجہ نذر رکھا، میں نے اپنی قوم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا، اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کی ریت کے مانند بڑھاؤں گا اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازوں پر قابض ہو جائے گی، اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی۔

قرآن پاک میں ہے:

وَإِذْ أَسَّأَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبَّهُ بِمَا كَانَتِ
فَاتَّهَنَ قَالِ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ
إِمَامًا (بقرہ: ۱۲۵)

وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّا
فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ، إِذْ قَالَ
لَهُ رَبُّهُ اسْلُبْهُ قَالَ اسْلُبْتُ

لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (بقرہ: ۱۲۶)

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا
كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (صفت: ۲)

وَعَلَّمَ الْإِبْرَاهِيمَ
لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرَهُ، بَلْ كَرِهَ اللَّهُ
مَعَاشِرَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ
اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (بقرہ: ۱۲۷)

اللَّهُ يَتَّخِذُ الَّذِينَ كَفَرُوا
رِبَاطًا وَهُمْ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ
رِبَاطِهِمْ لِيُقَرَّبُوا لَهُمْ
فَهُمْ يَكْفُرُونَ (بقرہ: ۱۲۸)

اللَّهُ يَتَّخِذُ الَّذِينَ كَفَرُوا
رِبَاطًا وَهُمْ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ
رِبَاطِهِمْ لِيُقَرَّبُوا لَهُمْ
فَهُمْ يَكْفُرُونَ (بقرہ: ۱۲۹)

اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتوں میں اسکی آزمائش کی، پھر اسے انکو پورا کیا تو خدا نے اس سے کہا کہ میں تجھے لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔

اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چنا اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کر دے، اس نے کہا میں نے اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کر دیا۔

اسے ابراہیم، تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یہی اچھے کام کرنا ہوں گے اور اللہ کے ساتھ ہیں۔

خدا یا تو محمد اور محمد کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کر، جس طرح تو نے ابراہیم اور ابراہیم کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کی۔

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنے عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم، رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا

جسکو بڑا کیے بغیر دنیا کی پیشوائی اور آخرت کی نیکی نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے بیٹے کے خون سے زمین کو زخمین کر دینا تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، آسائوں اور آرزوؤں کی قربانی تھی اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو مدموم کر دینا تھا، اور جانور کی نذر کی قربانی اس

اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو مدموم کر دینا تھا، اور جانور کی نذر کی قربانی اس

اندرونی نقش کا ظاہری عکس، اور اس خورشید حقیقت کا ظلی مجاز تھا۔

اسلام قربانی ہے | اسلام کے لفظی معنی اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور اطاعت اور بندگی کیلئے گردن جھکا دینا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفہ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

فَلَمَّا سَلِمَا وَلِلْجَبِينِ جب ابراہیم اور اسماعیل اسلام لائے (یا فرمانبرداری کی پانچے کو خدا کے (صفت: ۳) سپرد کر دیا، اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل نہیں پر لٹایا۔

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ اِبْرَاهِيمَ
الَّذِي سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَا
فِي الدُّنْيَا وَاٰتَيْنَا فِي الْاٰخِرَةِ لِمَنِ
الصّٰلِحِيْنَ اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ
قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
(رقبہ: ۱۶)

اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند کرے گا، لیکن وہ جو خود بیوقوف بنے، ہم نے اسکو دنیا میں مقبول کیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا، جب اسکے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لادیا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے، اسے کہا میں نے پروردگار عالم کی فرمانبرداری کی رہا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا

الغرض ملت ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے اور یہی ابراہیمی ملت ہے اور اسی بار امانت کو اٹھانے کے لیے حضرت ابراہیم بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ میں موجود رہیں، اور بالآخر ان کی نسل میں وہ امین پیدا ہو، جو اس امانت کو لیکر تمام دنیا میں وقف عام کر دے، چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی:

رَبَّنَا وَاٰجَعَلْنَا مُسْلِمِيْنَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا
اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ مَّا وَاٰرَبْنَا مَنَّا وَكُنَّا
وَتُبَّ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ رَبَّنَا وَاَبْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا اپنا فرمانبردار بنا) اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبردار) جماعت بنا، اور ہم کو مناسک (رجح) کے دستور بنا، اور ہم کو معاف کر، بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار اس میں اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنانے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک اور صاف کرے تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، یہ کتاب قرآن پاک تھی، یہ حکمت سینہ محمدی کا خزانہ علمی و عملی تھا، اور یہ مناسک اسلام کے ارکان حج تھے۔

یہ قربانی کہاں ہوئی | حضرت ابراہیم نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، تو یادہ میں اس مقام کا نام مورہ یا موریرہ لیا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے اور بلوطون کے جھنڈ، یا بلند

زمین اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن محتاط مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراہ کا وہ عربی ترجمہ ہے، جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ سے مشہور میں اوسکسورڈ یونیورسٹی کے مطبع میں چھپا ہے اس میں اس مقام کا نام "موریا" لکھا ہے اور اس کے فارسی ترجمہ میں جو انہی زبانوں کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۸۵ء میں لندن میں چھپا ہے اس کا تلفظ "موریا" کیا ہے، اور وہ حقیقت یہ لفظ مورہ ہے جو مکہ میں بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے۔

"خدا ابراہیم را امتحان کرده بدو گفت سے ابراہیم، عرض کرد بسبب، گفت کہ اکنون بسر خود را کہ یگانہ تست و اور دوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزمن موریا برد، و اور اور آن جا بر کے از کوه بلوکه بتوشان می برم برآ تر بانی، سوختی بگذران، با مدادان (صحیح) ابراہیم برخاسته اللہ (گدھا) خود را بیلاست و دو نفر از نوکران خود را پسر خویش اسحاق برداشته و ہمیزم برآئے قربانی سوختی شکستہ روانہ شد و ہونے آں مکانیکو خدا اور فرمودہ بوز رفت و در روز سوم ابراہیم چہاں خود را بلند کرده آں مکان را از دور دید، آن گاہ ابراہیم بخدا مان گفت شناس جا بمانید تا من با پسر بدانجا، رویم، و عبادت (دوسرے ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزد و شما باذائیم" (پیدائش: ۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے، اور ہماری جماعت میں سے جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الراہی الصیح فی من ہوا الذبیح" نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے، اس لیے یہاں بحث بے محل ہے، بہر حال حضرت ابراہیم کو حضرت اسماعیل کی قربانی کے لیے جو مقام بتایا گیا تھا وہ کمر زمین مردہ تھی، وہ اس مقام سے جہاں وہ قیام پذیر تھے، چند روز کی مسافت پر تھی حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کی شریعتوں کے مطابق نذر دہی تھا کہ جس مقام پر قربانی گزارا جائے وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لیے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیم نے خدا کی عبادت کی، اور سجدہ کیا، اور وہ قربان گاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ کہا جاسکے کہ میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں، یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتیں، اور نہ یہود و نصاریٰ کے لیے کسی دوسرے مقام کو ثابت کر سکے اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاق کی نسل (بنی اسرائیل) میں موجود تھی اور نہ ہے اور نہ بیت المقدس، یا مسیح کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے۔

برخلاف اس کے کہ بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی، عربوں میں اس قربانی اور اس کی خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزار ہا برس سے محفوظ چلی آتی ہے، اور گو اس میں امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی یا با بعد کی گراہیوں کے سبب سے اس میں بعض مشترکات نہ رسوم کی آمیزش ہو گئی تھی، عرب میں بت پرست بھی تھے سارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی تھے، مگر عربوں کے قدیم اشعار سے ثابت ہے کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف ہے، یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اس کی قسمیں کھاتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے بتوں کی صفیں تھیں، حضرت

ابراہیم، حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویریں تھیں۔

مکہ اور کعبہ کا کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا سمت القدم ہے، وہ انزل سے اس دنیا میں خدا کا معبد، اور خدا پرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی، اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ،

أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ

سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا۔

(زال عمران: ۱۰)

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا پتلا چراغ پھر روشن کیا، تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چھ دیواری بلند کر کے، دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق راج (۴، ۳) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی اَلْبَيْتِ الْعَتِيقِ (پُرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مل کر اس گھر کی بُرائی بنیادوں کو ڈھونڈ کر پھرنے سے ان پر چھار دیواری کھڑی کی فرمایا، اِذْ سَوَّعْنَا اِبْرٰهِيْمَ وَاسْمٰعِيْلَ مِنَ الْبَيْتِ (ابراہیم جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی، حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیمؑ نے عراق، شام، مصر ہر جگہ پھر کر، آخر اسی گناہ گوشہ کو منتخب کیا، جو باسلطوت جباروں اور بت پرستوں اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرائی ہر چار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا، اس لیے قسراں پاک نے کہا:

وَإِذْ أَبَوْنَا إِلَىٰ بَرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ

اور ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا،

أَنْ لَا تُشْرِكَ بِي شَيْئًا رَّجِحًا

بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی البتہ دیواریں بے نشان تھیں، تو ہم نے ابراہیمؑ کو اسی گھر کی جگہ بتادی اور اس کو ان کی جا پناہ اور ٹھکانا بنا دیا کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں۔ توراہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذریا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قبر بانگاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لیے لائے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا، کہ وہاں جا کر عبادت کرو کے واپس آتا ہوں ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لیے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں، بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے، وَطَهَّرَ بَيْتِي (اور میرے گھر کو عبادت گاہوں کے لیے پاک و صاف کر) اس وقت تک اس سر زمین کے لیے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو مجموعہ توراہ میں حضرت یسماٰن کے زمانہ سے ملتا ہے

لے اخبار مکہ لا ذرتی وفتح الباری ذکر ہدم اصنام کعبہ و سیرت ابن ہشام :

اس سے پہلے اس کا نام پررب یا دکن کا ملک تھا، کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا، اور کبھی اس کا نام بیابان تھا، اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا، لفظ عرب (عرب) کے اصلی معنی بیابان و صحرا ہی کے ہیں، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے جنسی وقت یہ فرمایا تھا۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي

خداوند! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھتی کی

تو حقیقت میں یہ بن کھتی کی ترانی اور بے آب و گیاہ میدان اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی

اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی، اور اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے یہاں حضرت اسماعیلؑ کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی تھی:

فَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ (بقہ: ۱۵)

اور خداوند! یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہنچا۔

”مکہ“ قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابل یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنی گھر کے ہیں، اس سے دو تحقیقی ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قلعہ دھڑے گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے، بلکہ نام حضرت داؤدؑ کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گزرا ہے یہاں پر اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں ”بک“ کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے یعنی بعل کا شہر بعل دیوتا کا نام ہے، یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ

پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا، وہ

لَلَّذِي بِبَكَّةَ (زال عمران: ۱۰)

کعبہ کے لغوی معنی ”چوکھونٹے“ کے ہیں، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہے اس لیے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گزرا ہے، وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے:

ثمودیوں اور سبا والوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں

لے اخبار مکہ لا ذرتی، وفتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ، و سیرت ابن ہشام لے اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارعن القسراں کی پہلی جلد میں ہے، از صفحہ ۵۷ تا ۵۸ طبع اول سے تاریخ العرب قبل الاسلام جربی زبان صفحہ ۲۲۳ مصر کے گبن کی تاریخ عروج و زوال روم باب ۵۰ :

شود کا مقام شام و حجاز کی حدود میں تھا اور سب کا یمن میں ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں خانہ کعبہ ہے رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے پیر و کویس مورخ لکھتا ہے کہ اس میں رومی سپہ سالار یلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا اس پر سپہ سالار نے کہا

”تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں اور اس زمانہ میں وہ ہر قسم کے ہتھیاروں سے پرہیز کرتے ہیں۔“ ظاہر ہے کہ یہ منافح کا بیان ہے۔

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر کثرت ملتا ہے۔ یہاں تک کہ عیسائی عرب شعرا بھی عزت کیساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، عرب کے بازاروں اور سیلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسم حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک پہنچے ہیں کامیابی ہوئی، کیونکہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔

حج ابراہیمی یا دگار ہے | حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا اور اس پر لبیک کہا تھا اور جس کی تعمیل کے لیے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے اور عین اس وقت جب چھری لیکر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر گردن جھکا دی تھی تو آواز آئی تھی،

أَنْ تَابِرَهِيمُ قَدْ صَدَقَتِ الرُّبَيَا آتَا
كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ وَفَدَيْنَهُ
يَذْبَحْ عَنِّيهِ (صفت: ۳)

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر، بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کیلئے منحصر کر دینا اور اس کے ذریعے سے اس گھر کو دائرہ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے؛
وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا
اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور

۱۔ تاریخ الافہام فی توہم العرب قبل الاسلام، محمود پاشا علی مطبع امیر بولاق مصر صفحہ ۳۵ بحوالہ (دفریح) الشیخ جرنل اپریل ۱۸۵۱ء سے مولانا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف الامعان فی اقسام القرآن میں اس قسم کے اشعار جمع کر دیے ہیں کہ کتاب الامکنہ والاہمۃ امام مرزوقی طبع حیدرآباد جلد دوم صفحہ ۱۶۱ باب ۴۰

وَآتَخَذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى
وَعَهْدًا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهَّرَا
بَيْتِي لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ
وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا
بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ
مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ
إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ وَإِذْ
يُرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لِّكَ
وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ
التَّوَّابُ الرَّحِيمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا
مِّنْهُمْ لِيَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمَهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيَهُمْ إِنَّكَ
أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ وَمَنْ يَرْغَبُ
عَنْ مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ
نَفْسَهُ، وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا
إِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ وَإِذْ
قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ
الْعَالَمِينَ ط (بقرہ: ۱۲۵، ۱۲۶)

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ
لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهَّرَ بَيْتِي لِلطَّائِفِينَ
وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ
بِالْحَجِّ يَا تَوَكُّبَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ
مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِّيَشْهَدُوا مِنَّا فَحِ
لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي آيَاتٍ مُّعَلَّوَاتٍ

امن بنایا اور (کہا کہ) ابراہیم کے گھر کے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرو اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا، اور اس کے بسنے والوں کو کچھ پھلوں کی رزقی دے، جو ان میں سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے، خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا، اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا، پھر اسکو دوزخ کے عذاب کے حوالہ کر دوں گا، اور وہ کتنی بڑی بازگشت ہے اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے داوریہ دعا مانگ رہے تھے کہ، ہمارے رب (ہماری تعمیر کو) ہم سے قبول فرما، بیشک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے اے ہمارے رب اور ہم کو اپنا ایک تابع بنا (مسلم) فرقہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے ارکان بنا اور ہم پر اپنی رحمت رجوع کرو (ہماری توبہ قبول کرو) تو توبہ قبول کرنا والا اور رحم والا ہے اے ہمارے رب ان میں انہیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج جو ان کو تیری آیتیں بتائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک و صاف بنائے بیشک تو غالب اور دانا ہے اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے گا، بجز اسکے جو اپنے آپ کو نادان بنائے حالانکہ ہم نے اسکو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا اور آخرت میں نیکو کاروں میں سے ہو گا، یاد کرو جب اس نے اس سے کہا کہ ابراہیم! مسلم بن جا اسے کہا کہ عالم کے پروردگار میں تابع بنا (مسلم) بن گیا۔ اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ کسی کو میرا بھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرو اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) ڈبلی سواروں پر، ہر دور دراز راستے آئیں گے، تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چاہئے

عَلَى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ كَيْمَاتٍ الْأَنْعَامِ رِجْ
فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعَمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ثُمَّ
لِيُقْضُوا أَثْمُهُمْ وَلِيُؤْفُوا أُنْدُورَهُمْ وَلِيَطُوفُوا
بِالْبَيْتِ الْحَرَامِ، ذَلِكَ وَمَنْ يُعْظَمُ
حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ

(رج: ۲)

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا
أَمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ،
رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِمَّنِ النَّاسِ
فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي
فَأَنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُيُوتًا مِغْرِبِ
ذِي زُرِّعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا
الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي
إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ
يَشْكُرُونَ، رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي
وَمَا نَعْلَمُ مَا وَمَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِنْ
شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (ابراہیم: ۶)

قُلْ مَدَقَّ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ
حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، إِنَّ أَوْلَى
بَيْتٍ وَضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي
بِكَلِمَةٍ مِيْرًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ
فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ
وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَبِاللَّهِ عَلَى
النَّاسِ حُجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ
إِلَيْهِ سَبِيلًا، وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ
اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ

(ال عمران: ۱۰)

جانور روزی دیے ہیں ان پر ان کی قربانی پر چند جانور ہوتے
دونوں میں خدا کا نام لیں، تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بد حال فقیر
کو کھلاؤ اس کے بعد اپنا میل کچیل دو کر میں اور اپنی منقش
پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں، یہ سن چکے
اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے
لیے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی، اے میرے پروردگار اس
شہر کو امن والابنا، اور مجھ کو اور میری اولاد کو، توں کی پرستش
سے بچا، میرے پروردگار ان بتوں نے بتوں کو گمراہ کیا ہے تو جو
میری پیروی کرے گا، وہ مجھ سے ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے
گا، تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتے
کی ترقی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے
پروردگار یہ ایسے تاکہ یہ تیری نماز کھڑی کریں تو جو کچھ لوگوں کے
دلوں کو ایسا بنا کہ وہ انکی طرف مائل ہوں اور انکو کچھ چھو نہ
روزی دے، تاکہ یہ تیرے شکر گزار رہیں، اے ہمارے پروردگار
تجھ معلوم ہے جو ہم چھپائیں اور ظاہر کریں اور اللہ سے زمین
میں اور نہ آسمان میں کچھ چھپا ہے۔

کہہ کہ خدا نے حج فرمایا، تو ابراہیم کے دین کی پیروی کو ترک
سے مزہ موڑ کر، اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا بے شک
وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو ہم میں
ہے، با برکت اور دنیا کے لیے راہ نما، اس میں
کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے گھر سے ہونے
کی جگہ اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن پا جائے
اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے جس
کو اس کے راستہ سفر کی طاقت ہو، اور جو اس وقت
کے باوجود، اس سے باز رہے تو خدا دنیا والوں سے
بے نیاز ہے۔

یہ وہ آیتیں ہیں، جن کا تعلق اس موضوع سے ہے ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ
ہم نے ابراہیم کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر جن میں وہ سرگرداں اور آوارہ پھر رہے تھے
اور ایک امن کے سنان مقام کی تلاش میں تھے، تاکہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لیے ایک گھر بنائیں یہ ٹھکانا
کیا، جو ازل سے اس کام کے لیے منتخب تھا، تاکہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہم چار دیواری کو کھڑی کریں، اور
پھر اس کو توحید کامرکز اور عبادت گزاروں کا مسکن بنائیں۔

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا، اس لیے حضرت ابراہیم نے دعا مانگی کہ خداوند! یہاں تیرے
مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں، ان کو روزی پہنچانا، اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا کہ وہ
ادھر آتے رہیں، اور ان کو اس لیے یہاں بساتا ہوں تاکہ وہ اس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی سے بچے
رہیں اور تیری خالص عبادت بجالائیں ان میں جو نیکو کار ہوں وہ میرے ہیں، اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کا تو مالک
ہے تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے، اور خداوند! میری اولاد میں ایک رسول بھیجا، جو انکو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیم کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں اور
ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ دور دور سے یہاں
آئیں اور اپنے دینی اور دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں اور اس قدیم خانہ خدا کا طواف کریں، اور یہاں
اسماعیل کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلائیں، اپنی نذر پوری کریں اور اس حالت میں وہ امن و
سلامتی کے مجسم پیکر ہوں نہ وہ کسی بے ہتھیار اٹھا سکتے ہوں، نہ ایک چوٹی تک کو مار سکتے ہوں، اور وہ اس
حالات میں ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پر تکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں اور چند روز
یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کریں۔

اد پر توراہ کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ ابراہیم اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں کوئی تباہی
کر شکر دیکھتے تھے تمدن کے ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھرے پتھر کو کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا
لیتے، وہاں قربانی گزارتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے، اسی قسم کا گھر یہ خانہ کعبہ تھا، یہ بھی توراہ کے حوالوں سے
گزر چکا ہے کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لیے جو شخص نذر کیا جاتا تھا وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈاتا
تھا نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر استرا لگاتا تھا، پھر جہاں یہ نذر کو رہے کہ اس گھر کی چھت پر نہ پڑھا کہ تیری برکتی
نظاہر ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کھڑا پہنتے تھے اور کر میں تہ بند باندھتے تھے، توراہ کے فارسی
اقتباس میں جو نقل ہوا ہے مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حضرت اسماعیل کی قربانی کے لیے آواز
دی تو حضرت ابراہیم نے جواب میں لبیک کہا اور دو میں ہے کہ میں حاضر ہوں کہا یہی صد لبیک اللہ
لبیک اسلامی حج میں اٹھتے بیٹھے لگائی جاتی ہے۔

یہ بھی گزر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے یا اشار
کرتے تھے حج میں یہ طواف کلاتا ہے، غرض انہیں سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں حج ہے۔

حج کی حقیقت | ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں عاصی حضرت ابراہیم کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو بزرگزیادہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاندہ کو عبودیت کے اظہار کو کسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدا کی نوازشوں اور برکتوں سے مالا مال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے۔ یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں، تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سٹے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیل کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں اس لیے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈواتے نہ ترشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں اور نہ خوشبو لگاتے ہیں اور نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں نہ سر پھپھکتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم اور اسماعیل تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے اور دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیم نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے۔

لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ
لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ
وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ
لَكَ (صحیح مسلم)

میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں سب خوبیاں اوسب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں، جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں اس لیے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدیق کرتے ہیں پھر جہاں سے جہاں تک و صفا سے مردہ تک، حضرت ابراہیم دودھ کر گئے تھے پھر مردہ پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے وہ الہام دوتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشائش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گزشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں خدا کے حضور میں گڑا گڑاتے ہیں روتے ہیں تصور معاف کراتے ہیں اور آئندہ زندگی کے لیے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمانہ باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیاب ربانی کے مناظر دور و دراز کے سفر اور ہجر کی محنت کے بعد اکثر دنوں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع اور لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں ایک ہی لباس اور شکل و صورت ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان اور

لہ ترمذی کتاب الحج باب ماجاء من ادرك الامام ويجمع فقد ادرك الحج

حلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعا مغفرت کی پکار گزشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا نام اپنی زبانوں کا اقرار اور پھر احساس کے ساتھ گریہ وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لیکر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہو کر، ایسا روحانی منظر ایسا کیف ایسا اثر ایسا گداز ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام علم فراموش نہیں ہوتی پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیم کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تشکیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت اور اسی فدویت اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جو کبھی اس میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت میں اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے دل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیم کے ہی الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں (صحیح مسلم کتاب الحج)

اِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلدِّينِ
قَطْرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ خَبِيثًا
وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ.

(انعام: ۹۰)

میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پسید کیا محمد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔

اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ
وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ
لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ
أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ.

(انعام: ۱۰۷)

میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام دنیا کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے اور میں سب سے پہلے مسلمان ہوں۔

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں۔

حج کی اصلاحات | حج کی فرضیت دوسری عبادت سے بالکل مختلف تھی عام اہل عرب نماز کے اوقات، ارکان اور خصوصیات سے علماً نابلد تھے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعلیم دی اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی، اس لیے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنا پڑیں، روزہ نے بھی یوم عاشورہ سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقہ استعمال بدل گیا تھا، یا ان میں بعض مشرک کارز رسوم داخل ہو گئی تھیں، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بیک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱۔ ہر عبادت کی اصلی عرض ذکر الہی، طلب مغفرت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی

وخاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنایا تھا، چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکے تھے تو تمام قبائل منیٰ میں آکر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الہی کی جگہ اپنے اپنے آباء و اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ
أَوْ أَشْدَّ ذِكْرًا (بقرہ: ۲۵)

۴۔ قربانی کرنے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے۔ یہودیوں میں بھی یہ رسم تھی، کہ قربانی کے خون کا پھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلادیتے تھے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹا دی گئیں اور یہ آیت اتری:

لَنْ يَسْأَلَ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَاءُهَا
وَلَكِنْ يَسْأَلُهُ التَّقْوَى
مِنْكُمْ (حج: ۵)

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے اور اس جشن ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

۲۔ اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے تو زاد راہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی اس پر آیت نازل ہوئی:

وَتَزُوَدُوا وَإِن خَيْرُ الزَّادِ التَّقْوَى
(بقرہ: ۲۵)

۳۔ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لیے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبہ اللہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا اور مرد مرد دل کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کیلئے کپڑا مستعد رویتی تھیں اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم ہ جاتے تھے ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا، اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا اور یہ آیت اتری:

۱۔ بخاری جلد ۱ ص ۲۰۶ کتاب الحج کہہ طبقات ابن سعد ذکرہ حضرت حمزہ سید الشہداء بخاری جلد ۱ ص ۲۲۲ کتاب الحج۔
۲۔ بخاری جلد اول ص ۲۰۶ بخاری جلد اول ص ۲۲۲ کتاب الحج۔
۳۔ بخاری جلد اول ص ۵۳۱

خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف: ۳۱) ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔ اور سورہ کے صوم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کو اس اعلان کے لیے بھیجا کہ آئندہ کوئی ننگے ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت یہ رسم اٹھ گئی۔

۵۔ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لیے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا، چنانچہ یہ آیت اتری:

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ (بقرہ: ۲۵) کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں۔

۶۔ صفحہ اور مروہ کے درمیان میں جو وادی سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گزرتے تھے اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پائی تھی، لیکن اسلام نے اس کی کوئی سنت نہیں قرار دیا، یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

۷۔ جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قسم کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا، جو میلوں میں ہوتا ہے، شور و غل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھپر خانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشا وہاں ہوتا تھا، اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا اور حج کو تقدس، اتوداع، نیکی اور ذکر الہی کا سترتا پار قیام بنا دیا جس کا حکم آیا:

فَمَنْ قَرَضَ فِيهِنَّ الْحَبِيبَ فَلَا رَفْثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَغْتَحِطُ بِهِ اللَّهُ (بقرہ: ۲۵)

۸۔ مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کستا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گنہگار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام تھا، جو دیر میں واپس ہوتے تھے، چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گنہگار نہ تھا، اس لیے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا:

فَمَنْ تَعَمَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ
وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ
لِيَمُنَّ التَّقَى (بقرہ: ۲۵)

۹۔ ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا، یعنی حج کا احرام باندھتے تھے، تو چپ رہتے تھے چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وہ بے پروا تھی، معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے انہوں نے اسکو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے۔

۱۔ بخاری کتاب الحج باب لا يطوف عربان بخاری کتاب الحج، جلد اول ص ۲۲۶ بخاری جلد اول ص ۵۳۳
۲۔ بخاری جلد اول ص ۵۳۱

طبع کا ذریعہ تھیں، وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لیے کسی جاندار کی جان لینا بہر حال خود غرضی ہے۔ لہذا سے تمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے۔ ہونے پھرے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے، لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی اس لیے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلعے ہونے پڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ دہانہ طہ تہ مزوری کاموں کے لیے باہر رہے۔ یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی نقیض ہے جو اس لیے اس وقت کے لیے پسند کیا گیا تاکہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل و صورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہ عالم و عالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے جو بالکل سادہ بے تکلف اور زیب و زینت سے خالی مقرر کی گئی ہے۔

طواف، یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کردعائیں مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے جو حضرت ابراہیم کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کیا جاتی تھی چنانچہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چلنا ہے اس لیے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جس کا ایک مژدوی ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ **كُنَّا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ** (خدا دنا ہم کو دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا)۔

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو۔ اور حکم ہوا کہ:

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (رج: ۲۵) اور اس پرانے عہد کا طواف کریں۔

حجر اسود کا اسلام، حجر اسود کے لفظی معنی "کالے پتھر کے ہیں، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے، خانہ کعبہ بیسوں دفعہ گرا اور بنا، کبھی سیلاب میں بہ گیا، اور کبھی آگ میں جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیم کے ہاتھوں پڑی تھی ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں، مگر اس عہد شفیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا، اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے (الایہ کہ شاعرہ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لیے نکال کر لے گئے، اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا، اور اسی لیے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمحل ہے اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف

کے شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی کٹڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں یہ نہ سہی تو اس کی طرف اشارہ بھی کر کے قناعت کر سکتے ہیں، یہ پتھر کعبہ کے لیے تو ایک معمولی پتھر ہے مگر ایک مشاقی زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام سے لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے مقدس لب، یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں اور پھر تمام خلفائے راشدین، صحابہ کرام، ائمہ اعلام، اکابر اسلام اور حکمائے عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں، ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے اور باایں ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادہ توحید کے ایک ہتھیار متوالے نے اس کو چوم کر کہا "اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں اس لیے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا ہے، الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں، بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیم و اسماعیل کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں، جواب بلانے نام رہ گئی ہیں، تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہاں حضرت ابراہیم اپنی سواری کے گرجوں اور ٹوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیل کو لیکر آگے بڑھے تھے اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب کی آواز سے ڈک گئے اور اسماعیل کی جگہ پر مینڈھا قربانی کیا بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل کو لیکر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہ صفا و مروہ کے درمیان بانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زم زم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفا و مروہ کی سعی انہیں کی اس مضطر بانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے کے عظیم شان طبع حضرت ابراہیم اور ہاجرہ کو نظر آئے:

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ
فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا (بقرہ)

بے شک صفا و مروہ خدا کا شعار ہیں، تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے، اس کا اس پر پھیر لگانا، گناہ نہیں۔

وقوف صرفہ عرفات میں نویں ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے مغرب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں معروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرف اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں۔ یہیں جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آنے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورہ حج کا آغاز، حشر کے بیان سے ہوتا ہے یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر موثر منظر دلوں میں مغزرت اور رحمت الہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے ہر شخص کو داہنے بائیں، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ | حج کا زمانہ بھیر بھار اور دوڑ دوڑ کا ہوتا ہے، مغرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے ہیں اسی حالت میں اگر مٹی کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خشکی سے چور ہو جاتے اسی لیے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لیے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا اسلام نے اس لیے اس لیے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام ہے اس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار آیا:

فَاذْكُرُوا اَفْئُتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا
اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ
كَمَا هَدٰكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ
لَمِنَ الضّٰلِّينَ (بقرہ: ۲۵)

توجہ عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس
خدا کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو،
جس طرح اس نے تم کو بتایا، اور تم اس
سے پہلے حق کی راہ کو بھولے ہوئے تھے۔

منیٰ کا قیام | یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں۔ رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی اور مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا اس لیے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لیے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے، یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے چلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں، یہیں قربانی کی جاتی ہے باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخری کیا کرتے تھے جو اکثر

لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی اس بیسودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کے بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف، محبت، مساوات اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے فرمایا:

وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ (بقرہ: ۲۵) خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔

قربانی | یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سر روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے، جس میں لوگ ایک دوسرے کو دوست احباب کو اور فقرا اور مساکین کو کھانا کھلائیں۔

اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے جو جانور خلعے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فیر کو کھلاؤ۔

وَ يَذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيّامٍ مَّعْدُوْمَاتٍ عَلٰى
مَا رَزَقْتَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةٍ اَوْ لَيْثًا مِّنْ فُلُوْا
مِنْهَا وَاَطْحَمُوْا الْبَابِئِنَّ الْفَقِيْرَ رِجْ (۴۰)

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے۔

توجہ عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھانے
توجہ قربانی اس سے ملنے ہو وہ کرے جس کو یہ بھی
یسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات
دن واپس ہو کر۔

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا
اُسْتَيْسِرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ
فَمِيَامٍ ثَلَاثَةَ اَيّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةَ
اِذَا رَجَعْتُمْ (بقرہ: ۲۴)

حق | اس منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس پرانی رسم کی تعبیر ہے، کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے، ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یا نگار کا اشارہ چھپا ہے تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لیے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

اپنے سروں کو منڈا کر یا بال ترشوا کر۔
اور اپنے سر منڈاؤ، جب تک قربانی اپنی جگہ
پر نہ پہنچ جائے۔

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسِكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ (فتح: ۴)
وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ
مَجْلَةَ (بقرہ: ۲۴)

رمی جمار | منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو قربانی کے لیے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں دوسو ڈالا، انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا، جس کے لفظی معنی سنگریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا، اور لے تو رات قاضی ۱۳-۵ گنتی ۵-۵۰ سے سعد جز ثانی قسم اول ص ۳، دسیرۃ ابن ہشام، بیرونہ، واقعہ عمرو ابن امیہ و جزنا حیثہ واعتقہ

اسی لیے شیطان کو رجم یعنی کنکری مارا گیا کہتے ہیں۔ صاحب نظام القرآن کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند عذار یعنی عربوں نے اس کی رہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگمانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا، جس کا ذکر سورہ فیل کی آیت تَرْتَجِبْنَ عَنْ حِجَابِ رَجُلٍ مِّنْ سَبِيلِ میں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا، اور وہ عذار بھی ہلاک ہوئے، یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی تَرْتَجِبْنَ کے معنی ہے۔ خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو..... ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے دوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں، چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

فَاِذَا قُضِيَتْ مَنَاسِكُكُمْ فَاذْكُرُوا
اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ وَاَشَدَّ
ذِكْرًا (بقرہ: ۲۰۱)

جب سب ارکان ادا کر چکے تو اپنے باپ دادوں کو
جیسے یاد کرتے ہیں، ویسے ہی خدا کو یاد کرو،
بلکہ اس سے بڑھ کر۔

اسی رمی جبار پر مراسم حج کا غائم ہوتا ہے۔

ان رسوم کی غایت اور پر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لیے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دور ترقی کا عہد آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے اور ہمارے جذبات و احساس کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد اپنے گناہوں کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کر کے، تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ کنکری مارنے سے صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے:

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيّٰمٍ
مَّعْلُوْمَاتٍ (حج: ۲)

اور تاکہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام
یاد کرو۔

حج کے مقامات عموماً غیر از نشان اور ربانی نشان کے جگہ گاہ ہیں، جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں، اور اسی لیے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شَعَائِرُ اللّٰهِ اور حُرُوفَاتُ اللّٰهِ ہے، یعنی خدا کے نشانات اور اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں اور انہیں شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکان حج ہے، سورہ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے:

مشکوٰۃ باب رمی جبار بحوالہ دارمی و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح ترمذی، سنائی، دارمی و مستدرک حاکم کتاب الحج ۶

وَمَنْ يَعْظَمْ حُرْمَتِ اللّٰهِ
فَهُوَ خَيْرٌ اَلَيْهٖ عِنْدَ رَبِّهِ (رج: ۴)

اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ
اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے۔

صفا و مروہ کی نسبت ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ (بقرہ)

اور صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں۔

اور سورہ حج میں فرمایا:

ذٰلِكَ وَمَنْ يَعْظَمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا
مِنْ تَقْوٰى الْقُلُوْبِ (رج: ۴)

یہ ہے اور اللہ کے شعار کا ادب کرے تو یہ دلوں
کی پرہیزگاری ہے۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے، تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔

حج کے آداب | حج کے لیے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لیکر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیک و پاکبازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو، وہ لڑائی جھگڑا اور روزگنا فساد نہ کرے کسی کو تکلیف نہ دے، یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لیے جائز نہیں، کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و آمان ہوتا ہے۔

نوجوان میسوں میں حج اپنے اوپر فرض کرنے تو
حج میں نہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا اور نہ
گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا ہے اور جو بھی نیک کام
کرد اللہ اس کو جانتا ہے۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ
وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ
وَمَا تَفَعَّلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمُهُ
اللّٰهُ (بقرہ: ۲۵)

غَيْرُ مُجْتَلٰى الْقَيْدِ وَاَنْتُمْ حُرٌّ (مائدہ: ۱)

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں ان کو راستہ میں تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو
لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا کہ یہ اس خانہ الہی کے پاس ادب کے خلاف ہے تاکہ عرب جیسے بے
امن ملک میں ان اور رہنروں اور بد معاشوں کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رکے۔

اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو
حلال سمجھو، جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی
کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔

وَاٰمِيْنَ الْبَيْتِ الْحَرَامِ يَتَتَفَعَّلُوْنَ
فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا
(مائدہ: ۱)

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصد ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے
جس کا نام کفارہ ہے، یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی، یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا
یا اتنا ہی روزہ رکھنا، فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوْا الصَّيْدَ
لِے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو مت مارو

وَ أَنْتُمْ حُرْمٌ، وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ
مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّمَّا قُتِلَ مِنَ النِّعَمِ
يُحْكَمُ بِهِ ذُو عَدْلٍ مِنْكُمْ هُدًى
بِلُغَةِ الْكُفَّةِ أَوْ كِفَارَةٌ طَعَامٌ مَسْكِينٍ
أَوْ عَدْلٌ ذَلِكَ صِيَامًا يَذُوقُ وَيَبَالُ
أَمْرِهِ - (مائدہ: ۱۳)

اور تم میں جو جان کر مارے گا تو اسکے مارے
ہونے کے برابر بدلہ ملائی میں اسکا فیصلہ تم
میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ اسکو کعبہ تک پہنچا
کر قربانی کی جلے، یا اس کے گناہ کا اتار ہے، کچھ
محتاجوں کو کھانا کھلانا، یا اسی کے برابر روزے
تا کہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح و سلامتی اور امن و آشتی ہے، اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی
حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آجاتا ہے۔

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں | محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کا تکمیل صحیفہ لیکر آنے اس کی سب
سے بڑی خصوصیات یہی ہیں کہ دنیا و دین کی جامع ہے اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتر لکھنے
معمور ہے، وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لیے کسی باہر کی امداد کا محتاج
نہیں بلکہ اس نے ان اہلکار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے
مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی میں مذکور ہیں۔

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسماعیلی کی نذر اور مکہ میں ان کے قیام
کے سلسلہ میں جو دعائیں وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کی جامع ہے، آئیے ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں :

وَ اذْجَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاٰمِنًا
وَ اتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّیٰ
وَ عٰهَدْنَا اِلٰی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ
طَهِّرَا بَيْتِیَ لِلطَّائِفِیْنَ وَ الْكٰفِیِّیْنَ
وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَ اذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ
رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بِلَدِّ اٰمِنًا وَ اَرْزُقْ
اَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرٰتِ

اور جب ہم نے اس گھر کعبہ کو لوگوں کا مرجع مرکز
اور امن بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی
جگہ بناوا اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کے یہ ذمہ کیا
کہ تم دونوں سے گھر کو طواف کرنے والوں اور سجدہ کرنے
والوں کے لیے پاک و صاف کرو اور جب ابراہیم نے کہا،
میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا، اور اس کے
رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دے۔

(بقرہ: ۱۵)

لے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا تابعدار کرے بنا،
اور ہم کو ہمارے اولاد میں سے کچھ کو اپنا فرزند بنا
کرے بنا اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بنا اور ہم کو صاف کرے
بے شک معاف کرے اور ہم کو روزی دلا ہے اور ان میں
انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمِیْنَ لَكَ وَ مِنْ
ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَكَ وَ اٰرِیْنَا
مَنَّا سَكْنًا وَ ثَبَّ عَلَیْنَا اَنْتَ الْتَوَّابُ
الرَّحِیْمُ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ
رَسُوْلًا مِنْهُمْ (بقرہ: ۲۵)

وَ اذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرٰهٖمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
اَنْ لَّا تُشْرِكَ بِیْ شَیْئًا وَ طَهِّرَ بَيْتِیَ
لِلطَّائِفِیْنَ وَ الْكٰفِیِّیْنَ وَ الرُّكَّعِ
السُّجُوْدِ وَ اذَّیْنِیْ فِی النَّاسِ بِاَلْحِجِّ
یَا تُوَكَّلُ رِجَالًا
وَ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَا تِیْنِیْنِ مِنْ
كُلِّ فِجْجٍ
عَمِیْقِیْ لَیْشَهِدُ وَ اٰمِنًا فِیْ
لَهُمْ وَ یَذْكُرُوْا
اِسْمَ اللّٰهِ فِیْ اٰیٰتِہٖ مَّغْلُوْمٰتٍ
عَلٰی
صَاذَقْتَهُمْ بِبَیْمَتِہٖ الْاَلْعٰمِرِ
رَجَّحَ ۳۰
وَ اذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ
ہٰذَا
بِلَدِّ اٰمِنًا وَ اجْعَلْ بَیْتِیْ
وَاٰمِنًا لِّتَعْبُدَ
الْاَصْنَٰمَ رَبِّ اِنَّہُمْ
اَضَلُّوْا كَثِیْرًا مِّنْ
النَّاسِ ۴۰ فَصَنُّ
تَبَعْنِیْ فَاِنَّہٗ صَنِیُّیْ
وَ
مَنْ عَصٰنِیْ فَاِنَّكَ
عَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۵۰
رَبَّنَا
اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ
ذُرِّیَّتِیْ بَوَادِیْ
غَیْرِ ذٰلِکَ
وَ اِنِّیْ لَظٰلِمٌ
لِّنَفْسِیْ ۶۰
وَ اِنِّیْ
لَا اَجِدُ اِلٰہًا
غَیْرَکَ ۷۰
وَ اِنِّیْ
لَا اَجِدُ اِلٰہًا
غَیْرَکَ ۷۰
وَ اِنِّیْ
لَا اَجِدُ اِلٰہًا
غَیْرَکَ ۷۰

(ابراہیم: ۶)

ان آیتوں میں حسب ذیل باتوں کی تصریح ہے :

۱۔ خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن و مسکن ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیم نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گزار اور خدائے

واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تاکہ پہلے کی طرح
یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے اور آخر ان میں رسول مبعوث ہو، جس کی صفیتیں ایسی ہوں۔

۳۔ یہ لوگ ایک دیرانہ میں جس میں کھیتی نہیں، آباد ہوتے ہیں، اور صرف اس غرض سے آباد ہوتے ہیں کہ
تیرے گھر کو آباد رکھیں، تو تو اس بے شر اور رشور زمین میں ان کی روزی سامان کو ان لوگوں کے دلوں کو
ان کی طرف بھکانا کہ وہ ان سے محبت کریں۔

۴۔ حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستے سے لوگ لبیک کہیں گے

اور جب ہم نے ابراہیم کو یہ گھر کی جگہ بتادی کہ میرا
شریک نہ بنا نا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کو
ہونیوالوں، رکوع و سجود کرنے والوں کیلئے لوگوں میں
حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیادہ اور سفر کی
ماری دہلی تیلی ہو جانے والی، اونٹنیوں پر سوار ہو کر،
دور دراز راستے سے آئیں گے تاکہ فائدہ کے جگہوں میں
آگے جمع ہوں اور چند مقررہ دنوں میں اس بات پر خدا کا
نام یاد کریں کہ ہم نے انکو جانور روزی کیے۔

جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس آبادی کو
والی بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کر ہم
بتوں کی پوجا کریں، میرے پروردگار ان بتوں نے
بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا تو جس نے میرا کہا مانا
مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو سخت
والا رحم کر نیوالا ہے، ہمارے پروردگار! میں نے
اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس
گھر کے پاس آباد کی ہے ہمارے پروردگار! تاکہ وہ
نماز پڑھیں تو لوگوں کے کچھ دلوں کو ایسا بنا
وہ ان کی طرف بھکیں اور ان کو پھلوں کی روزی
دے تاکہ شکر گزار رہیں۔

تاکر یہاں اگر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ آیام میں خدا کا نام لیں۔
۵۔ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں، خداوند اتوان کے گناہ معاف کرے، تو بڑا مہربان ہے اور رحیم ہے۔

۶۔ خداوند! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستے پر چلے اس لیے تمام وہ لوگ جو ملتِ ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیم ہیں اور وہی حضرت ابراہیم کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں، الغرض حج کے ہی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں، مرکزیت | خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفیتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرہ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا یہ روحانی علم و نیرت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا، یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں، جو مختلف ملکوں اور اقلیتوں میں بے تہ ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب ہی باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو اتم القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ و روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں ایک لکھ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانیت کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لیے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں، دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں اس لیے یہ حرم ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتی ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت اور وطنیت کی ٹنگائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی کی تجدیدی پیکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی لوگ آج تمام دنیا کے لیے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد و کوشش میں مصروف ہیں، مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آل ابراہیم کے لیے ہر دراز

سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے، اور اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے آج دنیا کی قومیں "ہیک" (ہولینڈ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں، لیکن مسلمان اقوام عالم کے لیے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے، یہ حج کا موسم ان کی سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا، یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے اسپین سے لیکر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے اور مختلف ملکوں کی رعایا آ کر، اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی اور انصاف پائی تھی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائل حج کے فوراً ہی بعد، اللہ تعالیٰ نے ملک میں فساد اور بے امنی کی برائی کی اور فرمایا :-

بعض آدمی ایسے ہیں کہ انکی بات دنیا کی زندگی میں صلی معلوم ہوتی ہے اور جو اسکے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ پہلے درجہ کے جھگڑا لو ہیں اور جب بیٹھے پھیریں تو ملک میں دوڑتے ہیں کہ اسپین یعنی بریابو اور تاکر کھتیاں اور جانیں تلف ہوں اور اللہ فساد کر نیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْجِبُكَ قَوْلُهُ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللّٰهُ
عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهِ وَهُوَ الَّذِيْ اَخْصَاہُ
وَإِذَا تَوَلٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ
فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ
وَ اللّٰهُ لَوِجِبُ الْفَسَادِ (بقرہ: ۲۵)

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا:
اے ایمان والو تم اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو کہ تمہارا وہ کھلا دشمن ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَدْخُلُوْا فِي
السَّلٰمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (بقرہ: ۲۵)

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بسال دور دراز اقلیموں، ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے، اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکے و تنہا رہا، ۶۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیٹھ کر دفعہ خطاب کیا اور سب نے سماع و طاعت کہا، آپ کے بعد خلفائے راشدین اور دوسرے خلفائے زمانہ صحابہ کرام

اور ائمہ اعلام نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں۔

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے مجاہد اور عالم، محدث، مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نوآبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آکر یہاں کھٹ جاتے تھے اور دنیا کے تمام گوشوں سے آکر حرم ابراہیم میں جمع ہو جاتے ہیں اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا ابراہیمی درگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے، ہمیں آکر بخارا کا باشندہ، اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی، عراقی اور مصری ججاری سے، بصری کوئی سے کوئی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے انڈسی، سندھی (ہندوستان) سے رومی یعنی فیض پاتا تھا اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی، مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام میں پہنچ جاتا تھا، ابن مسعود کے شاگرد ابن عمر اور عائشہ کے تلامذہ سے اور ابن عباس کے مسترشد ابو ہریرہ کے مستفیدوں سے اور انس کے حلقہ کے فیضیاب علی کے شاگردوں سے مستفید و سیراب ہوتے تھے، یہی وہ مرکز تھا جہاں ائمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات و معاذی اور احکام و فرائین و ضایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا، اور آپ کے سیر و معاذی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدوں ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آگئیں اور مؤلفاً، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود میں آئے اور ائمہ مجتہدین کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے اماموں کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجتماعی مسائل کو الگ کر سکیں اور اس سے پہلے کہ کتابیں مدوں ہوں اور پھیلیں ہر ملک اور ہر شہر کے علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکے اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے۔

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے یہیں آکر چینی، مراکش سے تونسہ ہندی سے تاتاری جستی سے فرنگی زندگی سے عجمی عربی سے یمنی نجدی سے اتر کر افغانی سے مصری، ترکستانی سے روسی الجزائر سے افریقی یورپین سے جاوی بلغاری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے، زمانہ کے

رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتے ہیں الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیائے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات و واقعات کے لیے بے چین نظر آتا ہے، پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کو بھی اچھی خاصی تعدد ایسی ملے گی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا اور خشکی و تری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی، دنیا کے جغرافیائی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے مسلمانوں میں بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گزرے ہیں جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کر لی، یا قوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویر البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافیائی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو قرار دیا ہے۔

رزق ثمرات | اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس شور ویرانی میں بسنے والوں کے لیے رزق کا کوئی سامان کیا جائے، اسی لیے حضرت ابراہیم نے دعائے مانگی تھی کہ خداوند امین نے اپنی اولاد کو اس سبب حاصل اور بے آب و گیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکانا اور ان کے رزق کا سامان کرنا اور ان کو پھیل کی روزی دینا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کے لیے زکوٰۃ و خیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی، لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی لیبی اور دونوں نظریوں کا سبب ہو جاتی، وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاتے۔ جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنا دیا۔ حضرت اسماعیل کی اولاد کا جہاں کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتی ہے، حضرت یعقوب ہی کے زمانہ میں جو حضرت اسماعیل کے بھتیجے اور حضرت اسحاق کے بیٹے تھے بنی اسماعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے (تکوین ۳۷-۲۸-۲۶ تک) توراہ کے متعدد مقامات میں عرب سوداگروں اور تاجروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے، خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے جس کا ذکر سورہ 'الذیلادف قریش' میں ہے وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام و مصر اور روم تک جاتے تھے۔

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کے لیے کافی نہ تھی اس لیے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک میلہ تھا اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا کہ یہ دماغی ابراہیمی کا مصداق اور اس شور و جھج حاصل زمین کے بسنے والوں کے لیے روزی کا سامان تھا، اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کمالات لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کھپالی سکیں مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے تو پورے راستے اور منزلوں کے بدو اپنے پھیل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور

لے نسیل اور حوالوں کے لیے دیکھو میری تالیف الرحمن القرآن جلد دوم باب تجارت العرب قبل الاسلام :

خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں، کھانا، پینا، مکان، سواری اور دوسری ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور یہی ذریعہ معاوضہ اہل مکہ کے قوتِ لاموت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قربانی کی اقتصادی حیثیت | اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی خیر ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے اس بنا پر قربانی کے فریضے نے بھی ان اہل عرب اور اہل بادیہ کے لیے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا، ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں جن میں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی اور عموماً دنبہ کی قیمت آٹھ روپے اور بکری کی چار روپے و مل ہوتی ہے، تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپے ہر سال اہل بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے ہیں اور یہ اس بے آب و گیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے۔

ابراہیمی دعا کی مقبولیت | حضرت ابراہیم نے اپنی دعائیں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا۔
وَازْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الشُّجَرَاتِ
اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے
روزی دینا۔
(بقرہ: ۱۵۰)

اس دعا کا اثر یہ ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل، میوے، سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے۔

تجارت | قرآن پاک کے محاورہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے
اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک مرتب مقصد تجارت اور حصولِ رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے:
وَلَا أَقْسِمُ بِالْبَيْتِ الْكُحْرِ إِنِّي عَبَّدَ الْجَمْعَ
اور نہ ان کو (تساؤ) جو اس ادب والے گھر کے
فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَأَفْضَلُ مِن رَّبِّهِمْ وَأَفْضَلُ مِن رَّبِّهِمْ وَأَفْضَلُ مِن رَّبِّهِمْ
قسد سے جا رہے ہوں اپنے پروردگار کا فضل اور
خوشنودی تلاش کرتے ہوئے۔
(مائدہ: ۱۰)

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔
تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے اس لیے اسلام کے بعد بعض صحابہ نے اپنے

لے یہ تخمینہ میں اپنے پہلے سفر حج کے تجربے کی بنا پر جو ۱۳۴۲ھ میں کیا تھا، لگایا تھا، مگر اس کے ۲۳ برس بعد ۱۳۶۵ھ میں جب دوبارہ حج کی توفیق ملی تو زمانے کے اقتصادی تغیرات نے پچھلے تخمینہ کو یک قلم بدل دیا، اب ہر چیز کی قیمت گرانی کی طرف مائل ہے۔ جانوروں کی قیمت بھی چرگنی نظر آئی بکری کی قیمت کم از کم سولہ سترہ روپے، گلے بیل کی قیمت اسی سے سو تک اور اونٹ کی ڈیڑھ دو سو تک نظر آئی، اب اس تخمینہ کی بنا پر ہر چیز کی قیمت چرگنی ہو گئی ہے۔ ۲۰ محرم ۱۳۴۱ھ اور اب ۱۳۴۲ھ میں تو قیمت کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں ہے (ناشر)

اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کہ لوگوں سے بھیک مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں، کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے، بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے، اور سربایا:

وَتَزَوَّدُ وَاغْلَانٌ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ اتَّقَوْا
وَالَّذِينَ يَأْتُوا بِاللَّيْلِ يُغْلِبُونَ
جُنَاحٌ أَنْ يَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكَ
اور راہ کا تو شر (خرچ) لے کر چلو، اگر راستہ کا سب سے
اچھا تو شر تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے، تم پر گناہ نہیں
ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے
چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں، درست نہ تھا کہ اول تو طلبِ رزق سہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی کی ترقی اور بقا ممکن نہیں، یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لیے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے یہ مقام گویا مسلمانوں کی عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ناکبِ اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے، جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے وہ کونسا اسلامی ملک ہے جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آسکتا، لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ بے بھی ہیں اور آج وہ مرکز ہوا اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا، یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے اس جنگِ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت | روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیات ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکان حج کے ادا کرنے سے قلب و روح میں پیدا ہوتی ہیں ان کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی اور تیسری خالص عثمانی ہے وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے، ہر زبان بولتے اور ہر لباس پہنتے ہیں تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے وہی ملتِ ابراہیمی کا مقام ہے، اسلام کا مولد اور قرآن کا مہبط ہے اس لیے دور دراز مسافتوں سے دلوں اور شوق کے بازوؤں سے اُڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ اُبلنے لگتا ہے اور ان کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے مسلمان جس ملک میں بھی ہے اس کو وہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا، ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں، اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا منظر بھی سامنے ہوتا ہے، لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے خالص رنگ میں جلوہ گرہ معلوم ہوتا ہے، گرد و پیش آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا جسم پیکر دکھائی دیتا ہے، اور اس وقت سرزمین عرب اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے جس طرح نوآبادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادر وطن (مدر لینڈ) کی حیثیت، آج انگریز، ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، ساہیرس جبل الطارق

نیز لیڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار اور افریقہ اور کینیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ ان کی نگاہ میں اس وسیع برطانوی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں مغروب ہوتا مرکز ہے وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر، ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہیں، جب ان کی آنکھیں اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہیں تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب اخلاق اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں۔ وہ اس کے ایک ایک درود و یار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس وقت ان کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے ملکوں قوموں اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پشمرہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور وہ یہاں آکر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمہ حیات میں نہا کرنے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں، بلا تشبیہ اسی قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہیں ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے تو اس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامن دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ جلا اٹھتا ہے۔

ذفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگریم
گر شمر دامن دل می کشد کجا اینجا است

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرکوں کا فراس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں، تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آکر مسلمان خالص، اور روح ایمانی کو تازہ کر سکیں قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو ام القریٰ یعنی آبادیوں کی ماں کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اس کا مرجع اور مادی تو ضرور ہے۔

تاریخیت | اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے آدم سے لیکر ابراہیم تک اور ابراہیم سے لیکر محمد رسول اللہ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تعلق ارض حرم کے کوہ و صحرا اور رود و دیوار سے ہے، یہیں حضرت آدم نے سکونت کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا، یہیں حوٰئے آکر ان سے ملاقات کی، یہیں نوح کی کشتی نے آکر دم لیا، حضرت ہود اور حضرت صالح نے یہاں پناہ لی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں ولادت پائی، یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اپنے گدھے چھوڑ کر اترے، یہیں وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی، یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہ کو پیاس کے عالم میں نظر آیا، یہیں وہ خانہ کعبہ ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا، یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکا کر اسی کے قریب منی، مشعر حرام اور عرفات ہیں، جو شاعر اللہ ہیں، یہیں وہ پتھر (حجر اسود) ہے جو ابراہیم و اسماعیل اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا، یہی وہ سر زمین ہے جہاں وہ گلیاں

اور راتے ہیں جو جبل یامین کی گزر گاہ تھے، یہیں وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحن حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تریپن برنس بسکر کیے اور یہی وہ مقام ہے جہاں براق کے قدم پڑے تھے اور یہی وہ مکانات ہیں جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے کیا قرآن پاک کا اشارہ انہیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں، جہاں اس نے کہا:

فِيهِ آيَاتٌ مُّبَيِّنَاتٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا يَوْمَ الْقِيَامِ
وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا لَيْسَ لَهُ حِسَابٌ وَلَا يَنْصَبُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامِ
وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا لَيْسَ لَهُ حِسَابٌ وَلَا يَنْصَبُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامِ
وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا لَيْسَ لَهُ حِسَابٌ وَلَا يَنْصَبُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامِ

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تر پنے لگتی ہے، بعد ہر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، اور زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط، اور شاعر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے:

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا
مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (رج: ۳)
وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرْمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ
لَّهُ عِنْدَ رَبِّهِ (رج: ۳)

خالص روحانیت | حج کی حقیقت میں گزر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ و دوپ کا نام نہیں یہ توحج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں اسی لیے سرور کائنات علیہ الصلوٰت نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ حج مبرور رکھا ہے یعنی وہ حج جو سراپائی ہو۔ اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے جو عرفات کے سائلوں کے لیے خاص ہے، حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت اور گزشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آئندہ کے لیے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیم میں مذکور ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ
ذَرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ
وَإِنَّا نَحْنُ مُسْلِمُونَ
أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

(بقرہ: ۱۵)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو دیا ہم کو معاف کر (تو بندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (ریبان کو معاف کرنے والا) اور ہم کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعائیں، ان کی دوسری دعاؤں کی طرح قبول کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوا کہ حج در حقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر، جہاں اکثر نبیوں، رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے اور ان مقامات میں کھڑے ہو کر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیرکاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹے ہوئے مولیٰ کو ماننا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو کر وہ تو اپنے نائب گنہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لیے ہر وقت تیار ہے وہ توجہ و کرم لطف و عنایت کا بحر بیکراں ہے۔

یہی سبب ہے کہ شیخ المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں، جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گزارتا ہے اس کا سورج ڈھتا ہے تو اس کے گناہوں کو لیکر ڈھتا ہے۔ صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے، وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جو انہوں نے مانگا وہ ہم نے قبول کیا، موطا امام مالک میں ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی بدر کے دن، کہ عرفہ کے دن کے سوا زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا اور غضبناک نہیں ہوتا، کیونکہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں، اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخلصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے، یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی وَاَرِنَا مَا نَسَكْنَا وَتُبَّ عَلَيْنَا اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا اور ہماری توبہ قبول فرما، کی تفسیریں ہیں۔

ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے، اسی لیے احرام باندھنے کیساتھ لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا میں حاضر ہوں، کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے طواف میں، سعی میں، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، منیٰ میں ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے اس لیے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں اس کے لیے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں، لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گونا گوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں، صدق توبہ کے لیے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہاں

لہ سنائی و ترمذی و ہزار و طبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد، کتاب الحج جلد اول ص ۱۲۳ میرٹھ لہ سنن ابن ماجہ باب ذکر التوبۃ

انبیاء علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوارِ الہی کی بارش ہوتی، وہ ماحول وہ فضا وہ تمام گنہگاروں کی ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا و نزاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ، وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد، جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں ناز و نیاز کے معاملات گزر چکے ہیں، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہتر مواقع ہیں جہاں حضرت آدمؑ و حوا نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد کے لیے دعا مانگی، جہاں حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈی جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں، جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لیے دعائیں مانگیں، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤں کے وہی ارکان، ہم گنہگاروں کی دعائے مغفرت کے لیے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پھر سے پھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور انسان اس ابر کرم کی پھینٹوں سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہاں برگزیدگانِ الہی پر عرشِ الہی سے برستا رہے، اور ہونڈاں ابر رحمت در نشان است۔

انسان کی نفسیت (سائیکالوجی) یہ ہے، اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لیے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حدِ فاصل کی تلاش کرتا ہے، جہاں پہنچ کر اس کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں اسی لیے لوگ اپنے تغیر کے لیے جاڑا، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحبِ اولاد ہونے کے بعد یا تعلیم سے فراغت کے بعد یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد یا کسی کامرید ہوجانے کے بعد بدل جاتے ہیں، یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خطہ الہی ہے جہاں سے ادھر یا ادھر مڑ جانا ممکن ہو جاتا ہے، حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام دیتا ہے اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع ہم پہنچاتا ہے، یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے ان بابرکت مقاموں پر حاضر اور وہاں کھڑے ہو کر جلیل القدر انبیاء نے کرام اور خاصانِ الہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ رحمت ہے اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف اور خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گذشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لیے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے اسی لیے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ نے یہ فرمایا:

مَنْ حَجَّ لِلَّهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمٍ وُلِدَتْهُ امَةٌ
نرکی اور گناہ نہ کیا، تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے

لہ سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے:

اس دن تھا جس دن اس کی ماں اس کو جنا۔
یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کی
بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہونگی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ ہے جو حج کے باب
میں ہیں اور جس کی آخری آیتیں، طواف کی دعا کا آخری ٹکڑا ہیں:

ثُمَّ أَفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَافَ
النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ
عَفُورٌ رَحِيمٌ فَإِذَا قَضَيْتُمْ
مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ
آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ
النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي
الدُّنْيَا وَمَالًا فِي الْآخِرَةِ مِن
خَلْقٍ وَمِنْهُمْ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ
حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ لَوَلِيَتْ
لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ
سَرِيعُ الْحِسَابِ ط

(بقرہ: ۲۵۰) کاتم سے جلد حساب لینے والا ہے۔

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں، مثلاً:

۱- حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے، حج اس وقت فرض ہوتا ہے
جب اہل وعیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لیے آدمی حج کے لیے اس وقت نکلتا ہے جب اہل وعیال
کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے اس لیے اس کو اہل وعیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہوجاتی
ہیں معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے بکدوش ہو جائے
اس لیے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔

عام طرز معاشرت اور دینی کاموں میں آدمی اپنے سینکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے لیکن جب خدا کی
بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے اس لیے رخصت کے وقت
ہر قسم کے بغض و حسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے لوگوں سے اپنے تصور معاف کرواتا ہے، روٹھوں کو
منائب قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے اس لحاظ سے حج معاشرتی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی
ایک ذریعہ ہے۔

۲- اسلام آج ہر ملک میں ہے اس لیے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے، تاہم اس کی ایک عمومی زبان
بھی ہے جو اس ملک کی زبان ہے جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں اور اس زبان کے
بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں اس کا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو
وہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک
مضبوط کڑی ہے۔

۳- مساوات اسلام کا سنگ بنیاد ہے اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے لیکن پوری
وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے، جب امیر و غریب جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا
ایک لباس میں، ایک صورت میں، ایک میدان میں، ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں نہ کسی
کے لیے کوئی جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید۔

۴- بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسبِ حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مالِ حلال
صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے اس کو خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جو اثر انسان
کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

الغرض حج "اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، یعنی قومی ملی زندگی
کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ہر مسلمان کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔"

www.muhammadilibrary.com

جہاد

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ (حج: ۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلہ عبادات میں جہاد کا نام فقہاء کی تحریروں میں نہیں آتا مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس فریضہ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دیجائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تلوہر توپور سے پڑ گئے ہیں ان کو اٹھایا جائے۔

جہاد اور جہادہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر ایسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں اور ایسا رگوار کرنا، اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس رہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کیلئے اپنی اپنے عزیز و اقارب کی، اہل عیال کی، خاندان قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں و دشمنوں کی گوششوں کو توڑنا، انکی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، انکی حلوں کو روکنا اور اسکے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

انفوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جبکہ بغیر دنیا میں کوئی تحریر کی گئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے صرف دین کے دشمنوں کیساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے، یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم اور شریعت کو لیکر دنیا میں آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں، بلکہ عمل اور سر تا پا عمل ہے، آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق، گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان اور الیاتی کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد انہیں کہیں مطابقت عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ "تعود" دیا گیا ہے، "تعود" کا معنی "تعمیر" ہے، جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے، سورہ نساء میں ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَبِ
وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ
فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ
عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَلَوْ وَعَدَ اللَّهُ
مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو، اور پھر بیٹے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں، اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہر ایک سے

الْحُسْنَىٰ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا (نساء: ۱۳۱)
خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔

اس بیٹھے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھے، سستی کرنے اور آرام اذھونہ کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال "دونوں ہم معنی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوتے ہیں، اس لیے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے، یعنی ہر "جہاد" قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ اسی سورہ نساء کی آیت میں "اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں، جہاد بالنفس اور جہاد بالمال، یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جہان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کیلئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے، یہاں تک کہ اپنی جان تک کو جو کھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جانے، سولی پر لٹکانے جانے، تیر اور نیزے میں پھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لیے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سر بلند کرنے کے لیے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لیے تیار رہے، اسی جان اور مال کی باطل محبت، شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل متحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی جسمانی و روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی و سعادت کا یہ گھر صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جسکے سبب مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق و زنجیر کی گرا باری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی اپنی تلوار کی ڈھا، بال بچوں کی علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری، کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگانہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گزارا وہ دنیا کو معلوم ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ لَمْ يَأْتُوا بِالْحَدِّ وَالْهَيْبَةِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ هُمْ يَصْرَفُونَ (حجرات: ۲)

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ دَائِمَاتٍ فِيهَا أَنْهَارٌ كَثِيرَةٌ مِّنْ تَحْتِهَا أَنْهَارٌ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ (آل عمران: ۲)

جہاد کی قسمیں | جب جہاد کے معنی، محنت، سعی، مبلغ اور جدوجہد کے ہیں، تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو

سکتا ہے، علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں جہاد اکبر ہے۔ خطیب نے تاریخ میں حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے ان صحابہؓ جو ابھی ابھی لڑائی سے واپس آئے تھے فرمایا، تمہارا آنا مبارک، تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہونے نفس سے لڑنا ہے۔ حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں، چنانچہ ابن بخاری نے حضرت ابو ذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے۔ یہی روایت دہلی میں ان الفاظ میں ہے کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لیے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔ یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں، مگر وہ درحقیقت بعض صحیح حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (مکبوت)

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لیے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے، اور اگلے پینچروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے، اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز میں ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (مکبوت: ۱)

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لیے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں، یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کے لیے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے، یہی مجاہدہ، کامیابی کا ریزہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے، سورج میں ارشاد ہوا:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمُ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ (زج: ۱)

اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے، اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔

یہ اللہ میں محنت اور جہاد کرنا، جہاد اکبر ہے جس پر ملت البرہمی کی بنا ہے، یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام اہل عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا، ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ فرمایا کہ المجاہد من جاهد نفسه یعنی مجاہدہ وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔ صحیح مسلم میں ہے ایک دفعہ آپ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ تم پہلوان کس کو کہتے ہو عرض کیا "جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں" فرمایا "نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے، اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے۔"

۱۔ بحوالہ کنز العمال کتاب الجہاد ج ۲ ص ۲۸۵ حیدرآباد دکن ۱۹۸۵ء ایضاً کتاب الایمان ج ۱ ص ۳۹۹ مجمع مسلم باب من یبک لنفسه عند الغضب جلد ۲ ص ۳۹۶ ص ۳۹۶

۲۔ جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے اس کا دور کرنا ہر حق طلب کیلئے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تارکوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے، اسی لیے ارشاد ہوا کہ:

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (نمل: ۲۶)

تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستے کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ اور اچھی طرح سمجھا کر دے اور مناظرہ کرنا ہر توجہ سے اچھے اسلوب سے کر۔

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے، جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقہ دعوت کا نام جہاد بالقرآن ہے، کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت، اور اپنے لیے آپ مناظرہ ہے، قرآن کے ایک کچے عالم کو قرآن کی صداقت اور پچائی کے لیے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لیے اسی قرآن کی تلوار ملے تھی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پروں کو ہر میت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا:

فَلَا تُطِيعُ الْكُفْرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (نفرقان: ۵)

تو کافروں کا کمانہ مان، اور بذر یعد قرآن کے تو ان سے جہاد کر، بڑا جہاد۔

بذر یعد قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعے تو ان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر بڑا جہاد اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہو گا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر میں کتنی ہے، علما نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس کو جہاد کا متمم ہائشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابو بکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے، ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لیے عقل، فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے، اور ان کو اس راہ میں صرف کرے، اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں، ان کو اس لیے حاصل کرے کہ ان سے حق کی شاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام دے گا، یہ علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے۔

۳۔ جہاد بالمال: انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشاء بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو اپنے دل و عیال کے آرام و آسائش کے لیے بھی خرچ کیا جائے تو اس کی مرضی کے لیے دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپے پر موقوف ہیں، اس لیے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے، اس نثریہ کافر اہم کرنا اور اس کے لیے مسلمانوں کو اپنے اوپر ہر طرح کا اتیار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں

۱۔ احکام القسرة آن رازی قسطنطنیہ جلد ۲ ص ۱۱۹

عبادات قلبی

یہ اسلام کی ان عبادات کا بیان تھا جو جسمانی و مالی کہلاتی ہیں، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول انہیں بھی لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیک کام عبادت ہے اس لیے تمام امور خیر، خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہانے صرف جسمانی اور مالی عبادات سے بحث کی ہے لیکن حضرات صوفیائے جسمانی و مالی عبادات کیساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہانے اپنا فرض منصب عرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیائے علمائے فریضوں کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستگی کا کام لیا ہے، پیش نظر تصنیف نہ توفیق کی کوئی کتاب ہے، اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود ان فریضوں کو بتانا ہے جن کی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فریضوں جن کا مرتبہ عبادات پنجگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فریضے ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی لیے ان کا نام قلبی عبادت رکھا جاسکتا ہے یہ وہ فریضے یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنجگانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے، جس دے روح بن جاتے ہیں، یہ بات گویاں ہے محسوس ہے مگر کہنے کے قابل ہے کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک کر کے روح اور دوسری طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے عذوری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر شر کی تیز کے لیے خلش ہو، یہ تقویٰ ہے، پھر اس کام کو خدانے واحد کی رضامندی کے سوا ہر عرض و نیت سے پاک رکھا جائے یہ اخلاص ہے پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ ہے یہ توکل ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور وقتیں پیش آئیں، یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے اس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے بڑا چاہنے والوں کا بھی بڑا نہ چاہا جائے، یہ صبر ہے، اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کی بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے اور جسم و جان اور زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ شکر ہے۔

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے

❖

دِيَارِهِمْ وَأَوْدُوْا فِي سَبِيلِيْ وَقْتُلُوْا
لَا كُفْرَانَ عَنْهُمْ سِيَّئَاتِهِمْ وَلَا دُخْلَنَّهُمْ
جَنَّتِ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حَسْبُ
الشُّرَاكِ (ال عمران: ۲۰)

ان آیات کی تفسیر و تشریح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ احادیث میں مذکور ہے جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اور ان اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ میں ہے، اسی شہادت اور شہداء کے عقیدے کے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیر سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بیابان نظر آتا ہے یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی اور فرمایا کہ مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کر دوں اور پھر تیسری زندگی ملے اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں شاکر کر دوں، ذرا ان فقرات پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے ان میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستے میں میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں، پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہرزماں از غیب جان دیگر است
دائمی جہاد یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک یا دو دفعہ آتا ہے مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیر و ستون کی امداد، سیکاروں کی ہدایت امر بالمعروف نہی عن المنکر، اقامت عدل، رد ظلم اور احکام الہی کی تعمیل میں بہترین اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون، ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک منقطع سلسلہ نظر آئے، سورہ ال عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں آخری آیت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا
وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ
ال عمران: ۲۰

اسے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو، اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ، اور کام میں لگے رہو اور خدا سے ڈرو، شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔

یہی وہ جہادِ محمدی ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزگی کا نشان ہے۔

❖

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے | اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی سب سے بڑی تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں ہی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں:

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (بقرہ: ۱۰)

یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشاء اسی تقویٰ کا حصول ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ: ۲)

اے لوگو اپنے اس پروردگار کی جسے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ تم تقویٰ پاؤ۔

حج کا منشا بھی یہی ہے:

وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (حج: ۳)

اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَاهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنْكُمْ (حج: ۵)

خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لیے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہیے:

أَقْسَمُ أَنتَسُ بِنِيَانِهِ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللَّهِ (توبہ: ۱۳)

جس نے اس کی عمارت خدا سے تقویٰ پر کھڑی کی۔

البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم کی گئی۔

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے:

وَتَزَوَّدُ وَأَفَانٌ خَيْرٌ الزَّادِ التَّقْوَى (توبہ: ۱۳)

اور سفر میں زاد راہ لیکر چلو اور سب سے اچھا زاد راہ تقویٰ ہے۔

ہمارے زریب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے:

وَلِبَاسُ التَّقْوَى ذَالِكِ خَيْرٌ (بقرہ: ۲۱)

اور تقویٰ کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے۔

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے:

وَأَنْ تَحْفُوا أَقْرَبَ لِلتَّقْوَى (بقرہ: ۳۱)

اور معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے۔

إِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (مائتہ: ۲)

انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے

وَأَنْ تَصْبِرُوا وَاسْتَقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ

اور اگر صبر کرو، اور تقویٰ کرو تو یہ بڑی نعمت

مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (ال عمران: ۱۹)

کی بات ہے۔

وَتَتَّقُوا وَتَصْفَحُوا بَيْنَ النَّاسِ (بقرہ: ۲۸)

اور تقویٰ کرو اور لوگوں کے درمیان صلح کرو۔

وَأَنْ تَحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ

اور اگر اچھے کام کرو اور تقویٰ کرو، تو اللہ

بِمَا تَعْلَمُونَ خَبِيرًا (نساء: ۱۹)

تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ (دخان: ۴)

اہل تقویٰ تمام آخری نعمتوں کے مستحق ہیں | آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں انہیں تقویٰ والوں کا حصہ ہے:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّةٍ وَنَعِيمٍ (طور: ۱)

بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہونگے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّةٍ وَعُيُونٍ (ذاریات: ۱)

بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہونگے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّةٍ وَنَهْرٍ (قمر: ۱)

بلاشبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ (موسلات: ۱)

بلاشبہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ

یقیناً تقویٰ والوں کے لیے اُن کے پروردگار کے

جَنَّةٍ النَّعِيمِ (زمر: ۲)

پاس نعمت کے باغ ہیں۔

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا (بناء: ۲)

بے شک تقویٰ والوں کے لیے کامیابی ہے۔

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لِحُسْنِ مَآبٍ (ص: ۳)

لاریب تقویٰ والوں کیلئے بازگشت کی اچھائی ہے۔

کامیابی اہل تقویٰ کے لیے ہے | گو بنظاہر ابتداء میں اہل تقویٰ کو کسمپرسی محبتیں اور بلائیں پیش آئیں، یا بہت سی

حرام اور مشتبہ لیکن بنظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا

راستوں سے پرہیز کرنا پڑے، اور اس سے بچھا جائے کہ ان کو مال و دولت عزت و شہرت اور جاہ و منصب محرومی ہی لیکن دنیا

کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بنا پر

کام کے اچھے نرے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہیے، حالانکہ جو جتنا دور بین ہے اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری

نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے، حقیقی دور بین اور عاقبت اندیش وہ ہیں جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند

روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ آخرت کی دائمی اور دیر پا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں، اور جب انکی نظر آخرت

کے ثمروں پر رہتی ہے تو دنیا بھی اُن کی بن جاتی ہے، اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و نلاح انہیں

کی قسمت میں ہوتی ہے۔ مندرمایا :-

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (اعراف: ۱۵)

اور آخری انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (ہود: ۳)

بے شک انجام کار تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ . اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والوں کے لیے ہے . (زخرف: ۳)

وَالْحَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى (طہ: ۸) اور انجام کار تقویٰ کے لیے ہے .

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں | یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں، جب وہ کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں، اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے نہ لیں، یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے، تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دلعزیزی پیدا ہوتی ہے۔

ان اولیاءہ اذ المتقون (انفال: ۳) تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں .

فان الله يحب المتقين (ال عمران: ۸) تو اللہ بے شک تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے .

ان الله يحب المتقين (توبہ: ۱) اللہ بلاشبہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے .

وان الله يحب المتقين (جاثیہ: ۲) اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے .

میت الہی سے سرفراز ہیں | یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کے ثمر سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہیں، اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے۔

واعلموا ان الله مع المتقين (بقرہ: ۲۳) اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے .

(توبہ: ۱۶-۵) اور یقین مانو کہ لا یریب اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے .

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے | ایک کام ہزاروں اغراض اور سینکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے، مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انہیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کیساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا:

انما يتقبل الله من المتقين (مائدہ: ۶) اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے .

اس لیے انہیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقاء، قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی .

تقویٰ والے کون ہیں | یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت، اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لیے ہیں، یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں، قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دیدیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورہ زمر میں ہے:

والذی جاء بالصدق وصدق به اولئک هم المتقون لهم ما يشاءون عند ربهم ذلک جزاء المحسنین (زمر: ۲۳)

وہ ہے، جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا .

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ، اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لیکر آئے اور اس ابدی سچائی کو بدگمانی سے دور رکھے، اور وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادو سے بال بھر ہٹنا

نہیں چاہتا۔ لیکن اہل تقویٰ کا پورا طریقہ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الْآخِرِ وَالصَّلَاةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ

وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ

وَالْيَتَامَىٰ وَالصَّالِحِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ

وَالسَّالِفِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ

وَآتَى الزَّكَاةَ وَالصَّوْفُونَ بِعَهْدِهِمْ

إِذَا عَاهَدُوا وَأَجْرًا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ

وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ

الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ

الْمُتَّقُونَ (بقرہ: ۱۷۷)

لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر، اور پچھلے دن پر اور

فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا

اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں، یتیموں،

مسکینوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو اور

مگر دنوں کے آنا دکرانے میں دیا، اور سزا

کو بردبار کیا، اور زکوٰۃ ادا کی، اور جو وعدہ کر

کے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں اور

سختی، تکلیف، اور لڑائی میں صبر کرنا والے

ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے شہرے، اور یہی

تقویٰ والے ہیں .

ان آیتوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا، اور بتایا گیا ہے کہ یہی

خدا کی نگاہ میں سچے شہرے والے اور تقویٰ والے ہیں .

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے | تقویٰ اصل میں وقوفی ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے

اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر

ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تیز کی غلط اور خیر کی طرف رغبت اور شہ سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے

لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل

کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت

کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے:

وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا

مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (حج: ۳) اور جو شعائر الہی کی تعظیم کرتے ہیں تو وہ

دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے، اور وہ سبھی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی

اور مثبتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا، اور شعائر الہی کی تعظیم سے ان کو معمور

کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

ان الذین یغضون اصواتهم

عند رسول الله اولئک الذین

امتحن الله قلوبهم للتقوی لهم

مغفرة واجزر عظیم (حجرات: ۱)

بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دہی

آواز سے بولتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو

اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے ان کو مغفرت

بے اور بڑا بدلہ .

نہیں چاہتا۔ لیکن اہل تقویٰ کا پورا طریقہ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الْآخِرِ وَالصَّلَاةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ

وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ

وَالْيَتَامَىٰ وَالصَّالِحِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ

وَالسَّالِفِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ

وَآتَى الزَّكَاةَ وَالصَّوْفُونَ بِعَهْدِهِمْ

إِذَا عَاهَدُوا وَأَجْرًا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ

وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ

الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ

الْمُتَّقُونَ (بقرہ: ۱۷۷)

لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر، اور پچھلے دن پر اور

فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا

اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں، یتیموں،

مسکینوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو اور

مگر دنوں کے آنا دکرانے میں دیا، اور سزا

کو بردبار کیا، اور زکوٰۃ ادا کی، اور جو وعدہ کر

کے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں اور

سختی، تکلیف، اور لڑائی میں صبر کرنا والے

ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے شہرے، اور یہی

تقویٰ والے ہیں .

ان آیتوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا، اور بتایا گیا ہے کہ یہی

خدا کی نگاہ میں سچے شہرے والے اور تقویٰ والے ہیں .

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے | تقویٰ اصل میں وقوفی ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے

اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر

ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تیز کی غلط اور خیر کی طرف رغبت اور شہ سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے

لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل

کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت

کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے:

وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا

مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (حج: ۳) اور جو شعائر الہی کی تعظیم کرتے ہیں تو وہ

دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے، اور وہ سبھی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی

اور مثبتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا، اور شعائر الہی کی تعظیم سے ان کو معمور

کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

ان الذین یغضون اصواتهم

عند رسول الله اولئک الذین

امتحن الله قلوبهم للتقوی لهم

مغفرة واجزر عظیم (حجرات: ۱)

بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دہی

آواز سے بولتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو

اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے ان کو مغفرت

بے اور بڑا بدلہ .

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے:

فَالْتَمِمْهَا جُمُورًا وَتَقْوَاهَا (الشس: ۱) تو ہر نفس میں اسکا فحور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا۔

فحور تو ظاہر ہے کہ گنگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد، اور اصل الاصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرۃ و دیعت ہیں اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہر حال یہ دونوں الہام ربانی ہیں، اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے اس لیے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے، صحابہ نے کفار کے اشتعال دلانے اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحیروش کو تقویٰ فرمایا:

ادْجَعَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ
حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ
عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ
وَالزَّمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا
أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلًا رَسَخَ (۲۰)

یہاں جنگ و خونریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب، اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ

سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے، اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے:

فَاتَّقُوا اللَّهَ عِندَ هُوَ إِلَىٰ مَدْتَبِهِ
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (توبہ: ۲)

فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (توبہ: ۲)

جس طرح انسان کا فحور، بری تعلیم، بری محبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے اس طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے:

وَالَّذِينَ اهْتَدُوا زَادَهُمْ هُدًى
وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ (محمد: ۲۰)

اس سے عیاں ہے کہ تقویٰ ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے اور جس کا اثر ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت اور فطری تقویٰ پر، مزید دولت تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے، صحابہ کے مجمع میں ارشاد فرمایا:

التَّقْوَىٰ هَهُنَا (مسلم) تقویٰ یہاں ہے۔

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک و شبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیوں کی محرک ہے، اور وہی مذہب کی جان اور بنداری کی روح ہے اور یہی سبب ہے، کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتوں کا مقصد، اور تمام اخلاقی تعصیلات کا حاصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار | اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب نسب، فرمیں، نوع انسانی کے ان صدمہ خود ساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا، جس کا نام تقویٰ ہے اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے، اور اس لیے ہی مہماری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے ہر آواز بلند یہ اعلان کیا۔

جَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا
إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ
أَتْقَاهُمْ (حجرات: ۲)

اس اعلان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا اَلْكَوْمُ التَّقْوَىٰ یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے، اور اسی کے لیے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔

موزر وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

تو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پونا کر دو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہیں، تم بھی ان کیساتھ سیدھے رہو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس طرح انسان کا فحور، بری تعلیم، بری محبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے اس طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے:

وَالَّذِينَ اهْتَدُوا زَادَهُمْ هُدًى
وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ (محمد: ۲۰)

اس سے عیاں ہے کہ تقویٰ ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے اور جس کا اثر ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت اور فطری تقویٰ پر، مزید دولت تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

احسان

مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (قرآن)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مصنفہ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اسکی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے:

الاوان في الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله الا وهي القلب
بشیر ہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور وہ ٹکڑا جو تورا سارا بدن خراب ہوتا ہے، ہوشیار ہو کہ وہ دل ہے۔

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر چہ اور بڑے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لیے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس مقصود یا نفع کی طلب منفعت، طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے: **فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ** (المائدہ: ۱) تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گزاری کو اسی کے لیے، بشیر ہو کہ اللہ ہی کے لیے ہے، خالص اطاعت گزاری مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گزاری میں، خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر، یا مٹی کی مورت، یا آسمان وزمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہو کوئی باطل مقصود ہو، اسی لیے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا:

ادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (فرقان: ۱۷) کیا تو نے اسکو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنالیا، چنانچہ اسلام کی اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری باطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے **قُلْ اِنِّي اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ**، **وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُونَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ**، **قُلْ اِنِّي اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ**، **قُلِ اللَّهُ اَعْبُدْ مُخْلِصًا لَهُ دِينِي فَاَعْبُدُوا مَا شِئْتُمْ** **مَنْ ذُو نَبِهٍ ط (زمر: ۲)** قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے: **مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ** اطاعت گزاری کو خدا کے لیے خالص کر کے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پسلا رکھنے سے کہ وہ خالص خدا کے لیے ہو، یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو اور **اَلَّذِي اَبْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلَى** (دلیل: ۱) یعنی تمہارے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی غرض اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں

وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِي اِلَّا عَنِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (شعراء: ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰)
اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا میری مزدوری تو اسی پر ہے جو ساری دنیا کا پروردگار ہے
حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا:

يَقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَا لَاطِا اِنْ اَجْرِي اِلَّا عَنِ اللّٰهِ (هود: ۳)
اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے

خود ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا، میں تم سے اپنے لیے کوئی مزدوری و اجرت نہیں چاہتا اگر چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لیے:

قُلْ مَا سَا اَسْئَلُكُمْ مِنْ اَجْرٍ فَاِنْ لَكُمْ اِنْ اَجْرِي اِلَّا عَنِ اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (سبا: ۶)
کہہ کہ میں تم سے جو اجرت چاہتی ہوں تو وہ تمہارے ہی لیے، میری اجرت تو اللہ پر ہے، وہ ہر بات پر گواہ ہے۔
یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض، اور صرف خدا کے لیے ہے، دوسری جگہ فرمایا:

لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الصَّوْدَةَ فِي الْقُرْبٰى (شوری: ۲)
میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا مگر قربت داروں میں محبت دکھانا۔

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے، اسکے لیے وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں، اگر وہ اسکے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قربت داروں کا حق ادا کرو، اور آپس میں محبت رکھو۔ اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے:

قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهِ سَبِيْلًا (فرقان: ۵)
کہہ کہ میں تمہاری اس رہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، مگر یہی جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے۔

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کر لیں۔ دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے، لیکن اگر اسکی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض یا محض دکھاو اور نمائش تھا تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً ٹکڑوں سے گر جائیگی، اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اسکی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لیے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کم دنیاوی لحاظ سے بے غرض دیے منت اور بلا خیال مزد و اجرت اور

تَوَكَّلْ

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (ال عمران: ۱۷۴)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑے کسی حجرے یا خانقاہ میں بیٹھ رہ جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر دے گا، یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہا ہے، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی ابا بچوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں، جھوٹے صوفیوں نے ترک عمل، اسباب و تدابیر بے پروائی اور خود کام نہ کرنے کے دوسروں کے سہارے جیسے کا نام توکل رکھا ہے، حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورا ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کیساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس میں ضرورتاً ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدبیر اور جدوجہد و کوشش کا ترک ہی توکل ہوتا تو دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لیے جدوجہد و سعی و مسرت کی تاکید فرماتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر و احدا و رخنہ و حنین میں سواروں، تیر اندازوں، نذرہ پوشوں اور تیغ آنداؤں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔ توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے، تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہرائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کر لو، اور اس عزم کے بعد کام کو پوری استعداد اور تندی کے ساتھ کرنا شروع کر دو، اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا سب سے خواہ نتیجہ پیدا کرے گا، اگر ایسا نتیجہ نکلے تو اس کو خدا کی رحمت و مصلحت اور مشیت سمجھو، اور اس سے مایوس اور بوسے نہ بنو، اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ ضرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدوجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا، اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، ال عمران میں ہے:

وَشَارِكْهُ فِي الْأَمْوَالِ الَّتِي كَسَبْتَ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ

اور کام (یا لڑائی) میں اُن سے مشورہ لو، پھر جب پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بیشک اللہ

تعمین و شہرت کی طلب بالآخر ہو، یہ تعمین و شہرت کا معاوضہ بھی دین تو لوگ رہا دنیا بھی انہیں کو عطا کرتی ہے جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا کام انہیں شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے:

ہم جو کام بھی کرتے ہیں اس کی دو شکلیں پیدا ہوتی ہیں، ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضاء کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی جس کا ہیولہ ہمارے دل کے ارادہ و نیت، اور کام کی اندرونی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا، اور برکت دین اور دنیا دونوں میں اسی روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے، اسی لیے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہرگز مخلصانہ غرض و غایت سے بالا، اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھیں، تو رات اور قرآن دونوں میں طویل اور قابل آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ہے، دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیدائش کی قربانیاں پیش کیں، خدا نے اُن میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرما دیا۔

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (مائدہ: ۵) خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔

متقی بھی وہی ہوتے ہیں جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام کرتے ہیں، انہیں کام قبول ہوتا ہے اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخشا جاتا ہے، انکو خدا کے ہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں اُن کو ہر دلعزیزی ملتی ہے، ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں لوگ ان کے ان کاموں سے نسل بعد نسل فیضیاب ہوتے ہیں اور اُن کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں، حضرت موسیٰ کے ہمد میں فرعونوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، کہ ان دونوں سے انہوں نے عجائب و غرائب امور کا یکساں مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونوں کے عجائب و غرائب میں ظاہری نہیں باطنی صورت کا فرق ہے ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازیگری ہے اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی و روحانی زندگی کا انقلاب ہے، اسی لیے یہ فیصلہ ہے کہ:

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اتَىٰ رُطْبَةً (۲۰) اور جادوگر جہر بھی آنے فلاح نہیں پائے گا۔

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (توبہ: ۱۶)

مجھے اللہ بس ہے، نہیں کوئی معبود، لیکن وہی ہی پر میں نے بھروسہ کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔

آپس کے اختلاف میں اللہ کا فیصلہ چاہیے، اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے :

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (شوری: ۲)

اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے، تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف، وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے اور تسلی دیکھتی ہے کہ ان کے کفر و نافرمانی کی پروا نہ کرو، اور اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو۔

كَذَلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لِيَتْلُوا عَلَيْهِمُ الذِّكْرَ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَاب (رعد: ۴)

ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکیں، تاکہ تو ان کو وہ پیام سنانے جو میں نے تجھ پر وحی کی ہے، اور وہ رحمان کے ماننے سے انکار کرتے ہیں کہہ کر وہ میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہیں لیکن وہی اس پر میں نے بھروسہ کیا، اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کی شرارتوں سے پرانگندہ خاطر نہ ہونا چاہیے، کفار کو یہ آیت سادینی چاہیے۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ الْمَنَّانُ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ظُلُمَاتٍ مَبِينٍ (الملك: ۲)

کہہ دہی رحم والا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر بھروسہ کیا تو تم جان لو گے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔

جس طرح ہمارے رسول کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، ممانعتوں اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوتی ہے، آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اولوالعزم رسولوں کی زبان سے عملاً اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تنہا سا لہا سال تک کافروں کے فریضے میں پھنسے رہے تو انہوں نے پوری بلندگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرما دیا :

وَآتَلُّ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يٰقَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذَكَّرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرَكُمْ عَلَيْكُمْ عَمَةً تُوْفُوا إِلَيَّ وَإِن تَنْظُرُونَ (يونس)

اے پیغمبر، ان کو نوح کا حال سنا جب اُسے اپنی قوم سے کہا، اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ میرا نصیب کرنا تم پر شاق گذرتا ہے، تو اللہ پر میں نے بھروسہ کر لیا ہے تو تم اپنی تدبیر کو رو اپنے شرکیوں کو خوب مضبوط کر لو، پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی رہے پھر اس کو مجھ پر پورا کر لو، اور مجھے ہمت نہ دو۔

غور کیجئے کہ حضرت نوح دشمنوں کے ہر قسم کے مکر و فریب، سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت

کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبر نے شائستگی سے فرما رہے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے تہ اور غضب سے ڈراتی ہے، تو وہ جواب میں فرماتے ہیں :

إِنِّي أَشْهَدُ اللَّهَ وَأَشْهَدُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تَشْرِكُونَ مِنْ دُونِهِ فَمَنْ كَفَرَ فَوَدَّ جَمِيعًا شَرًّا لَا تَنْظُرُونَ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ ط (ہود: ۵)

میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک ٹھہرتے ہو، پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤد کر لو، پھر مجھے ہمت نہ دو، میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے، بھروسہ کر لیا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری ممانعتوں کی پروا نہیں، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے وہ کروں گا، میرا تکیہ خدا پر ہے :

إِن أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (ہود: ۸)

میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے، کام سدا نہ چاہتا ہوں میری توفیق اللہ ہی سے ہے اُس پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کی مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہیے :

قُلْ يٰبَنِي إِدْرِيسَ لَا يُؤْمِنُونَ أَعْمَلُوا عَلَيَّ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَمِلُونَ، وَانظُرُوا إِلَىٰ مَا مُتَّظَرُونَ، وَاللَّهُ غَيْبُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهَا فاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود: ۱۰)

کہہ دو ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو، ہم بھی کرتے ہیں، اور تم بھی نتیجہ کا منتظر کرو، ہم بھی کرتے ہیں، اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے آسمانوں کا اور زمین کا چھپا بھید، اور اسی کی طرف سارے کاموں کا فیصلہ لوٹا جاتا ہے پھر اسکی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ کرو۔

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزت و وقار سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَّاءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَخَدَّهٗ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَ لَكَ وَمَا أَمْرُكَ لَكَ مِنَ

تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم نے تمہارے مسلک کا انکار کر دیا، اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لیے کھل گئی جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لیے خدا کے دعا کروں گا اور مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں۔

اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا
وَإِلَيْكَ أُنْبِئْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (متنہ: ۱)

ہمارے پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف
ہم نے رجوع کیا، اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے۔
حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹوں کو مہر بھیجتے ہیں، لیکن فرط محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح ان کو
بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازے سے نہیں، بلکہ متفرق دروازوں سے
اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارساز حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکم ٹل سکتا ہے،
اس لیے تدبیر بھروسہ نہیں بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے۔

وَقَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنِّي الْبَابَ
وَاحِدًا وَادْخُلُوا مِنِّي الْبُيُوتَ
مُتَفَرِّقِينَ وَمَا أَعْنِي عَنْكُم مِّنَ اللَّهِ
مِنْ شَيْءٍ إِنْ أُلْحَقْتُ بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ
وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ (يوسف: ۸)

اور (یعقوب نے) کہا آئیے بیٹو! ایک دروازہ سے نہ
جانا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا، اور میں تم کو خدا
سے ذرا بھی بچانہیں سکتا، فیصلہ اسی کا ہے، اسی پر
میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر چلے کہ بھروسہ کرنے
والے بھروسہ کریں۔
حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا ہے کہ ظاہر تدبیر شان توکل کے منافی نہیں۔
حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں جب ان کی قوم ان کو زبردستی بت پرست بن جانے پر مجبور کرتی
ہے ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں:

قَدْ افترينا على الله كذبا بان عُدْنَا فِي
مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اذْجَنَّا لِلَّهِ مِنْهَا وَمَا يَكُونُ
لَنَا اَنْ نَعُوذَ فِيهَا اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللهُ
رَبَّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَيَّ
اللَّهُ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ
قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ
(اعراف: ۱۱)

اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آجائیں جب ہم کو خدا اس
بچا چکا، تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا اور یہ ہم نہیں ہو
سکتا کہ ہم پھر اس میں لوٹ کر جائیں، مگر یہ کہ ہمارا
پروردگار خدا ہی ہے، ہمارا پروردگار اپنے علم
سے ہر چیز کو سمائے ہے ہم نے خدا پر بھروسہ کیا، اے ہمارے
پروردگار ہمارا اور ہماری قوم کے بچ میں توحق کا فیصلہ کر
اور تو ہی سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شامہ نزر و قوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل
کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی، فرمایا:
يَقُولُ هَلْ اَنْتُمْ اٰمِنُوْنَ بِاللَّهِ
فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ (يونس: ۹)
اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر
بھروسہ کرو، اگر تم نہ سزا مند دار ہو۔
ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرات کے ساتھ جواب دیا:
عَلَيَّ اللهُ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً
لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ (يونس: ۹)
ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے پروردگار ہم کو ظالم
قوم کے لیے آزمائش نہ بنا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا، اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں
سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر سخن واقف ہے، یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے
قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرما دیا ہے۔

مَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ (طلاق: ۱)
جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔
یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے کہ اگر میاں بیوی میں بناہ کسی طرح نہ ہو سکے اور
دونوں میں قطعی علیحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عودت کو اس سے ڈرنا نہ چاہیے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا، اور ہم کہاں
سے کھائیں گے؟ خدا

خدا خود میرا سامان است ارباب توکل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور
کی نظر ڈالیے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں سے جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر
ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے، نجوم، موانع کی کثرت اور پُر زور مخالفتوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استقامت
عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل
میں یقین رکھیں۔

احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اور
سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں اونٹ کو چھوڑ کر خدا پر توکل کروں کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا یا اس کو
باندھ کر، ارشاد ہوا، اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو، اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا
کیا ہے طر بر توکل زانوے اشتر بہ بند۔

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں تاہم حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا
کے مطابق ہے۔

بعض لوگ توویذ گنڈا غیر شرعی بھارت پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب
تدابیر کو ان چیزوں سے مطلب براری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے دہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے لیکن
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس خیال کی تردید کی ہے اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے
ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے، یہ وہ ہونگے جو توویذ گنڈا نہیں کرتے،
جو بد سگونی کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے بلکہ اپنے پروردگار پر اعتماد اور توکل رکھتے ہیں، ایک دوسری حدیث
میں ارشاد فرمایا کہ جو دعوات اور توویذ گنڈا کرتے ہیں وہ توکل سے محروم ہیں، اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں

یہ حدیث بلفظ اعتقلاہا و توکل ترمذی (آخر ابواب القیامتہ ص ۳۱۳) میں اور قیودہ و توکل شعب الایمان
بہقی میں اور قیودہا و توکل خطیب کی رداۃ مالک اور ابن مساکر میں ہے رکن العمال جلد ۲ ص ۲۳ جلد ۲ ص ۲۳

بلکہ جابلانہ اور امام کی بیخ کنی ہے ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ اگر تم خدا پر توکل کرتے ہیں تو کل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو دیے روزی پہنچاتا ہے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں، اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بیٹھ کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں وہ روزی کے لیے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں، اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں حالانکہ انہیں اگر یہ یقین ہو کہ

وَمَا صُنْتُ أَسْبَغَ فِي الْأَرْضِ إِلَّا
عَلَى اللَّهِ رِزْقَهَا (ہود: ۱) خدا کے ذمہ ہے۔

تو وہ اس کے لیے جوری ڈاکر، قتل، بے ایمانی اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے اور نہ ان کو دلتنگی اور مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صبح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا
وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ
وَمَنْ يَتَّوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ
إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ مَا قَدْ جَعَلَ
اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (طلاق: ۱)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرے وہ اس کے لیے
مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا اور اس کو وہاں سے
روزی دینا جہاں اس کو گمان نہ ہو گا اور جو اللہ پر
بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو بس ہے، بیشک اللہ اپنے
ارادہ کو پہنچا کر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لیے
ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

ادب کی تفصیلات سے ہر دماغ کو توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں خود اعتمادی کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے لیکن اس خود اعتمادی کی ہر حد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہیں اس لیے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے خدا اعتمادی کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔

—

(بقیہ حاشیہ)

لہ شریعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں ہیں اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے لیکن آیات اور دعاؤں کا لکھ کر بدن میں ٹھکانا یا گھول کر پینا یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا ثابت نہیں ہے صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یبق و کتاب الرقاق و صحیح مسلم کتاب الایمان، جاہلیت میں اکثر بیماریوں کا علاج آگ سے داغ کر کے تھے لہ جامع ترمذی باب ماجاء مانی کرہیۃ الرقی، اصل الفاظ یہ ہیں مسن اکتوی او استرقی فہو برقی من التوکل (حاشیہ صفحہ ۲۱) لہ جامع ترمذی ابواب الزہد ص ۳۸ و حاکم :

صبر

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف: ۳۴)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو بر تو پر دے ڈال رکھے ہیں، وہ ان کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب انتقام نہ لے سکانا ہیں، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟ صبر کے لغوی معنی "صبر" کے لغوی معنی "رود کرنے اور سہارے کے ہیں یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا، اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیار کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرات اور ثبات قدر کے ہیں حضرت موسیٰ اور زفر کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین دفعہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت زفر کہتے ہیں:

إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا. وَكَيْفَ تَصْبِرُ
عَلَى مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا (کہف: ۹۱)

حضرت موسیٰ جواب میں فرماتے ہیں:

سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا (کہف: ۹۰)

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار اپنے پیغمبروں کے سمجھانے کے باوجود پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں، تو اس کی حکایت ان کی زبان سے قرآن یوں کرتا ہے:

إِنْ كَادَ لَيُضِلَّنَا عَنْ آلِهَتِنَا
لَوْلَا أَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا (فرقان: ۳۴)

یہ شخص (پیغمبر کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤں (بتوں) سے
ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم ان پر صبر نہ کرتے۔
اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہرتے) یہاں تک
کہ تم اے رسول، نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کی بت پرستی ہوتی۔

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (حجرات: ۱۱)

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے جو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کسیں کسیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، باایں ہرمان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں:

وقت مناسب کا انتظار کرنا | پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جسے وہ کرنا چاہتا ہے
وقت کا انتظار کرنا | حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام

کفار عذاب الہی کے جلد نہ آنے یا حق کی ظاہری بے بسی کے سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دل و زطنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طمنوں کی پر دانہ کرا ورنہ ان سے دل کو اداس کر بلکہ اپنے دهن میں لگا رہا، اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا۔

إِصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَادْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذِكْرًا (۲) ان کے کہے پر صبر کرو اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کرو۔

اس قوتِ صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لڑ لگائی جائے، اور اسکی طاقت پر بھروسہ کیا جائے۔

فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَالْآيَةِ (طہ: ۸۰ ق: ۳) تو ان کے کہنے پر صبر کر، اور صبح و شام اپنے پروردگار کی

ذکر صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعن و طنز کا دھیان نہ کیا جائے بلکہ اس کے جواب میں ان سے لطف و مروت برتا جائے، انسر مایا:

فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَأَجْمِرْهُمْ هَجْرًا جَبِيلًا (زل: ۱) انکے کہے پر صبر کر، اور اس سے خوبصورتی سے الگ ہو جا۔

دگر کرنا صبر کا جو تھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کو نواہوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے، اور تکلیفیں دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے، یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردگی دکھائی جائے، قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَإِنْ مَا قَبْتُمْ فَمَا قَبُولُكُمْ مَاعَوْذٌ لَكُمْ بِهِ وَلَكِن صَبْرٌ كَسْرًا وَخَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ، وَأَصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَتُكَّرُونَ، (نمل: ۱۶)

اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر برداشت کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے اور تو صبر کرو، اور تیرا صبر کرنا نہیں، لیکن خدا کی مدد سے، اور ان کا غم نہ کرا ورنہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے یا کسی اور سبب سے نہ ہو بلکہ صرف خدا کے لیے ہو۔

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرُؤُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ أُولَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد: ۲۰)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی، اور جو ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہِ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔

فرماتے ان کو مبارکباد دیں گے اور کہیں گے:

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد: ۲۰)

تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا، تو آخرت کا انجام اچھا ہوا۔ ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے کہ اسکے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی بگڑ فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے کیونکہ یہی اصل ہے جس میں یہ جو بہرہ و گوارہ عبادت کی تکلیف بھی اٹھانے کا، مصیبتوں کو بھی جھیلنے کا، اور دشمنوں کی بدی کا

جواب نیکی سے بھی دے گا، چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح بھی کر دی گئی ہے کہ درگزر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی جس میں صبر ہوگا۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ إِذْ قُرْبًا لَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ هُمْ (فصلت: ۵)

بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کا جواب اچھائی سے ہے، تو کیا برائی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، وہ تو ہی دوست سا ہو جائے گا، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں، اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے۔

جو لوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں ان پر خدا کا عذاب ہوگا، ایسا ایک صاحب عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت کرے اور معاف کرے، انسر مایا:

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (شوری: ۴۱)

راستہ انھیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لیے پُرورد مذاب ہے، اور البتہ جس نے برداشت کیا، اور بخش دیا، بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

ثابت قدمی

صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادری اور استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم پر بار بار استعمال کیا ہے، اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہونے، صادق القول اور استباز ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، انسر مایا:

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (بقرہ: ۲۲)

اور صبر کرنے والے، ثابت قدمی دکھانے والے، مصیبت میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت، وہی ہیں جو سچ بولے، اور وہی پرہیزگار ہیں۔

بولے، اور وہی پرہیزگار ہیں۔

اگر لڑائی آپڑے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں، خدا کی یاد، امام وقت کی اطاعت، آپس میں اتحاد و موافقت اور میدانِ جنگ میں بہادری اور صبر و استقامت۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قَاتَيْتُمْ فَتَةً فَاتَّبِعُوا وَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (انفال: ۶)

اے ایمان والو! جب تم کسی دستے سے مقابل ہو، تو ثابت قدم رہو، اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ نجات پاؤ، اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو، اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تم ہست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر دکھاؤ، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اور صبر دکھاؤ، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

حق کے مددگاروں کی ظاہر قلبت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ کی نظر سے مشاہدے اکثر گزرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دیدی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جانشینوں کو سکھا دیا تھا، جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ
يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ، يَأْتُونَ يَغْلِبُوا مِائَتِينَ
وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ
كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ، أَلَا نَحْفَظُ
اللَّهَ عَنْكُمْ وَعَلِمَاتٌ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ
مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ
يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ
اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ. (انفال: ۹)

اے پیغمبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھار، اگر یہ
بیس صبر کر نیوالے (ثابت قدم) ہوں تو دوسو پر غالب ہونگے
اور اگر سو ہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب ہوں گے
کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہیں، اب اللہ نے تمہے تحفیف کر دی
اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے، تو اگر سو صبر کر نیوالے
(ثابت قدم) ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے اور اگر ہزار (صبر
والے) ہوں تو دوسو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب ہوں گے،
اور اللہ صبر کر نیوالوں (ثابت قدموں) کے ساتھ ہے

میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروا نہ کریں، اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے
سے دو چند کا مقابلہ کریں، اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد انھیں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر اور ثبات سے کام
لیتے ہیں، حضرت طلوت اور جالوت کے قصہ میں بھی اسی نکتہ کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے۔

قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ
قَالَ الَّذِينَ يَنْظُرُونَ أَنَّهُم مُّلقُوا اللَّهَ كَفرَمِّن
فِيئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةُ كَثِيرَةٍ بِإِذْنِ اللَّهِ
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ، وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ
وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَثَبَّتْ أقدَامَنَا وَانصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ. (بقرہ: ۲۳)

طلوت کے ساتھیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اسکی
کے مقابلہ کی طاقت نہیں، انہوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے
ملنے، یہ کہا کہ بسا اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم
سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آتے ہیں اور خدا صبر و
ثبات دکھانے والوں کیساتھ ہے، اور جب یہ جالوت اور اسکی فوج کے
مقابلہ میں آئے تو بولے اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر بہا اور ہرگز ثابت قدمی
بخش اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہم کو نصرت عطا کر۔

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی شہرت رکھی ہے اور بتایا ہے کہ خدا انھیں کا ہے
جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنَّا بَعْدَ مَا
قَاتَلْنَاكُمْ جَاهِدُوا وَصَبِرُوا، (نمل: ۱۳)

پھر تیرا پروردگار ان کے لیے ہے جنھوں نے ایذا پانے کے بعد گھر
بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے اور صبر و ثبات کیساتھ ٹھہرے رہے۔

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لیے بھی اسی صبر و استقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی
اسرائیل کو نسرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آ پڑا، تو حضرت موسیٰ نے ان کو
پہلا سبق یہ سکھایا:

قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ
وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا
مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ

موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو، اور
صبر و استقامت سے کام لو، بیشک زمین خدا کی ہے، وہ
جس کو چاہتا ہے، اپنے بندوں میں سے اس کا مالک

الْمُتَّقِينَ. (اعراف: ۱۵)

بناتا ہے، اور انجام پر مینرگاروں کے لیے ہے۔
چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعدد میں بہت کم تھے، لیکن جب
انہوں نے ہمت دکھائی، اور بہادرانہ استقامت، اور صبر و ثبات قدمی سے مقابلے کے توان کی ساری مشکلیں حل ہو گئیں، اور کثیر التعداد
دشمنوں کے زخموں میں پھنسنے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے
رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر میں ظاہر کیا ہے، فرمایا:

وَإِذْ رَتْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَفُونَ
مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي
بَلَّغْنَا فِيهَا وَتَعْتُ كَلِمَةً رَبِّكَ الْحُسْنَى
عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا وَآوَدْنَا
مَكَانَ يَضْمَعُ فِرْعَوْنَ وَقَوْمَهُ وَمَا
كَانُوا يُعْرِشُونَ. (اعراف: ۱۶)

اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین
کی دراشت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے، اور
تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں
ان کے صبر و ثبات کے سبب سے پوری ہوئی اور
ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور
تعمیروں کو برباد کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لیے سر بلند ہوئی کہ اس
نے صبر اور ثبات قدمی سے کام لیا، اور اسی کے نتیجے کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا
فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أُمَّةً يُهْتَدُونَ
بِأَمْرِنَا لِمَا صَبَرُوا وَآوَدْنَا يَا تَبْنَا
يُوقِنُونَ. (سجده: ۳)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوا بنا لیے جو
ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے، جب انہوں نے
صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے۔

آیت بالانے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کیے ہیں، ایک احکام الہی پر یقین، اور دوسرا ان احکام
کی بجا آوری میں صبر اور ثبات قدمی، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے
کا شدت یقین اور پھر ان اصولوں کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔
غزوة اُحد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی بلکہ شہر مسلمان خاک و خون میں لٹھیر کر رہا تھا، خدا میں جانیں دیتے ہیں،
بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن و ملال کے ازالہ کے لیے پچھلے پیغمبروں
کی زندگی کی روداد ان کو سناتا ہے:

وَكَانَ مِنَ نَسَبِي قَاتِلَ مَعَهُ رَيْثُونَ
كثِيرٌ، فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا
وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ
إِلَّا أَن نَّالِيَ رَبَّنَا غَفِرْنَا لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا

اور کتنے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ جو کہ بہت سے خدا
کے طالب لڑے ہیں، پھر خدا کی راہ میں تکلیف
اٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اور نہ ان کے
دل بود سے ہوئے، اور اللہ ثابت رہنے والوں
رہا برین کو دوست رکھتا ہے اور وہ یہی کہتے رہے

فِي أَمْرِنَا وَتَبَّتْ أَقْدَامُنَا وَانْمُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ،
(ال عمران: ۱۵)

کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو ادا کر
میں ہمارے گناہوں کو معاف کر، اور ہمارے قدم ثابت رکھ
اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے اُن تو بہر تو بہر دوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے
ہیں، اور فرما دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کے مجبورانہ درگزر کا نہیں، بلکہ دل کی انتہائی قوت
ہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسے پر خاطر میں لانے کا نام ہے، ایک صاحب کا
کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر چارہ اور
خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے تصور کو جو اسی کی کمی (ذنب، یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا
ہے معاف فرمائے اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کر کے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخشے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے گیبانی
کے حصول کے لیے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و
استقامت سے قابو پانا۔

دنیا کی تسخیر یا بی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے انہیں کے حصہ میں ہے جن کو یہ پامردی
دل کی مضبوطی اور حق پر ثبات قدم کی دولت ملی، حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے
کہ اُن سے کھرے کھولے کی تیز ہو جاتی ہے اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا:
أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا
يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا
مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ (ال عمران: ۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ
نے (آزمائے) ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے
دالے ہیں، اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں۔

ضبط نفس | اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے جب وہ کسی بڑی کامیابی
یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے مگر یہی ضبط نفس کا
اصلی موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار اور کٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔
دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت تو ام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبط نفس اور اپنے آپ پر
قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و مغرور پیدا نہ ہو، اور غم و
تکلیف میں وہ اداس اور بددل نہ ہو، دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبط نفس ہے، انسانی
فطرت کے راز دار کا کہنا ہے:

وَلَكِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مَتَاعَ حَمِيَّةٍ ثُمَّ نَرْوِعُنَّهَا
مِنْهُ إِنَّهُ لَكَنُفُوسٌ كَفُورٌ، وَلَكِنْ أَذَقْنَا
نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءٍ مَسَّتْهُ لِيَكْفُرُوا
بِهَا وَكَلَّمَ اللَّهُ لُقْمَانَ
ذَهَبَ السَّيِّئَاتِ عَنِّي إِنَّهُ لَكَفِيرٌ فَخُورٌ،
اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں پھر اس
سے اسکو اتار لیں وہ نا امید و ناشکر ہو جاتا ہے اور اگر کوئی
مصیبت کے بعد اسکو نعمت کا مزہ چکھائیں تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ
دور ہو گئیں، بیشک وہ شادان اور نازان ہے، لیکن وہ حصول نے

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ
لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ كَبِيرًا، (سورہ: ۲۰)

صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کیے یہ لوگ
ہیں جن کے لیے معافی اور بڑا انعام ہے۔

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر | ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر پامردی سے ایک معنی کر بڑھ کر
فرض کو ہمیشہ ادا کرنا | وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر
ہوتا ہے، اسی لیے مذہبی فرائض و احکام کو جو ہر حال نفس پر سخت گذرتے ہیں، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے
رہنا بھی صبر ہے، ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری، اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا
امتحان ہے، اسی لیے حکم ہوا:

رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ
(مریم: ۴)

آسمانوں کا پروردگار اور زمین کا، اور جو ان دونوں
کے بیچ میں ہے سب کا، تو اس کی بندگی کر اور
اس کی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل و عیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے:
وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طہ: ۱۳)

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور آپ اُس پر قائم رہ
یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔

حسب ذیل آیتوں میں غالباً صبر سی مفہوم میں ہے وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈھا کرتے
تھے، اللہ تعالیٰ اُن کو خوشخبری سناتا ہے:

فَوَقَّاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ
نَضْرَةً وَسُرُورًا، وَجَزَّاهُمْ بِمَا
صَبَرُوا وَجَنَّةً وَحَرِيرًا، (دہر: ۱)

تو اللہ نے اُن کو اُس دن کی بلی بچایا اور اُنکو ترقی دلائی
سے ملایا اور اُنکے صبر کرنے کے معنی احکام الہی پر ٹھہر رہنے،
کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا۔

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں تو بر کسریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں
یہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائیں اور خدا کی باتوں کو سن
کر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، ان کے
لیے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی یہ بشارت سناتا ہے:

أُولَٰئِكَ يُجْزَىٰ وَنَّ الْعُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا (فرقان: ۶۱)

ان کو بہشت کا بھر دے گا کہ وہ صبر کرتے رہے۔

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو باہر خاطر، ظرافت و طبع اور تکلیف و مشقت ہونے
کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے اور بڑی باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام
ہے، بچتے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سوجود ہونا، صبح کو خواب بھر کی لذت سے کنار کش
ہو کر دو گانہ ادا کرنا، الوان نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود
خطرناک موقعوں پر بھی پجائی سے باز نہ آنا، قبول حق کی راہ میں شکر و آرام و راحت جان کر جیل جانا، سود کی

دولت سے ہاتھ اٹھالینا، حسن و جمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پابندی، صبر کی بہت ہی کٹری منزل ہے اور اسی لیے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے،

ان آیات پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جُحِبَتْ رُحْمَتُ الْجَنَّةِ بِالْمَكَارِهِ وَجُحِبَتْ رُحْمَتُ الْجَنَّةِ بِالنَّارِ بِالشَّهَوَاتِ (صحیح بخاری کتاب الرقاق صحیح مسلم کتاب الجنۃ) کاموں سے ڈھپائی گئی ہے۔

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جن کا مساو نہ جنت ہے، اسوقت دنیا میں نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے اسوقت دنیا میں بڑے پُر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں، اس عارضی ہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کیے بغیر احکام الہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانہ مال و دولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے اور اسوقت بھی مال حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے، مال حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کر لے تو یہ بڑی قوت کا کام ہے جو صرف صابروں کو ملی ہے۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جو قارون تھا اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے جن میں صبر و برداشت کا جوہر تھا انکی چشم بینا اسوقت بھی کھلی ہوئی تھی اور ان کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور کانی چیز کے دن کی ہے خدا کی وہ دولت جو نیکو کاروں کو بہشت میں ملے گی، وہ لازوال، غیر فانی اور جاودانی ہے۔

قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ زِينَةَ الدُّنْيَا لَيْسَتْ لَنَا مِثْلُ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ، وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيَلْكُوا ثَوَابَ اللَّهِ خَيْرٌ لِمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلْقِيهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ - (قصص: ۸)

جو لوگ جات دنیاوی کی آرائش کے خواہاں تھے وہ بولے کہ کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا وہ بڑا خوش قسمت ہے اور جنہیں علم ملا تھا انہوں نے کہا، تمہارا بڑا ہے، اللہ کی جزا ان کے لیے جو ایمان لایا اور نیک کام کیے سب سے اچھی چیز ہے اور اس حقیقت کو وہی پاسکتے ہیں جو صابر ہیں۔

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ، وَلَنَجْزِيَنَّهُ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ - (نحل: ۱۳)

جو تمہارا ہے وہ چمک جائے گا، اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہ جائے والا ہے اور یقیناً ہم ان کو جنہوں نے صبر کیا ان کی مزدوری ان کے بہتر کاموں پر دیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازیں ادا کیا کرو کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں، اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے، اس کے بعد ہے:

وَأَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (ہود: ۱۰) اور صبر کر کہ بیشک اللہ نیک کام کرنے والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔ صبر کے فضائل اور انعامات | یہ مزدوری کیا ہوگی، یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی۔

إِنَّمَا يُؤْتِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (زمر: ۲۰) صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی۔ جن محاسن اور محامد صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے، ان میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے:

إِنَّ الْمُتَلَمِّعِينَ وَالصَّالِحَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْمُخْتَبِينَ وَالْمُخْتَبَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَنَّانًا وَاجْرًا عَظِيمًا - (احزاب: ۵)

بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور پکے مرد اور پکی عورتیں اور محنت سمنے والے مرد (صابرین) اور محنت سمنے والی عورتیں (صابرات) اور خدا کے سامنے جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور زیاد

کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے تیار رکھی ہے، مغانی اور بڑی مزدوری۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے اس سے انسان کی کچھلی غلطیاں حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اُس کے معاوضہ میں ملتی ہے، یہی بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے:

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا أَمَتٌ فَاعْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالنَّاسِحَاتِ - (آل عمران: ۲۰)

رحمت اور خدا کی خوشنودی ان کو حاصل ہوگی، جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے، ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھالینے والے) اور بیخ بولنے والے اور بندگی میں گئے رہنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنا اور کھلی راتوں کو خدا اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جہالت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے، اور ان دونوں کے بیچ میں ان کے چار اوصاف گناہے ہیں، جن میں پہلا درجہ صبر، یعنی محنت سہارنے تکلیف بھیلنے اور پامردی دکھانے کا ہے دوسرا راستی اور استبازی کا تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا، اور چوتھا راہ خدا میں حشر کرنے کا۔

فتح مشکلات کی کنجی صبر اور دعا | بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے، دعا اور صبر، اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں، یہود جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہیں رہتا تھا،

اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں، یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے تو گریہ کر ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طلب روحانی نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا:

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (بقرہ: ۵)

اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو۔
دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبولِ حق کی راہ کی مشکلیں دور ہونگی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ایمان کے لیے اخلاص کی ترازو میں تلے کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا
بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ
وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ لَوْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُونَ، وَلَتَبْلُوُنَّكُمْ
بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ
وَالنَّفْسِ الْمَوْتِ وَالْمُؤَلَّاتِ
الضَّرِيحِ وَالْمُؤَلَّاتِ
الضَّرِيحِ إِذَا أَصَابَهُمُ
مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ
وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ،
أَوَلَيْكَ عِيْلُهُمْ
صَلُّوا مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ
مِّنَ رَبِّكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ،

(بقرہ: ۱۵)

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہیے، جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اس کو صبر، ضبط نفس اور ثابت قدمی سے برداشت کریں، اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے محکوم ہیں، آخر باز گشت اسی کی طرف ہو گی، اس لیے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہیے، اگر اس راہ میں موت بھی آجائے تو وہ حیات جاوید کی بشارت ہی ہے۔

شکر

وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ (اعراف: ۱۰)

لُغْت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تڑپتا نہ ہو، اور دودھ زیادہ دے۔ اس سے انسانوں کے موادہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کرے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے یہ قدر شناسی تین طریقوں سے ہو سکتی ہے دل سے زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو، زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے ثواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے، خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف ہی کی ہے، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

شکر کا اُلٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں، اسی سے ہماری زبان میں کفر ان نعمت کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی بُرا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرائض داری ظاہر نہ کرنا، کفر ہے جس کے ترکیب کا نام کافر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں:

إِنَّ هَدْيَنَا هُوالسَّبِيلُ إِنَّمَا شَاكِرًا
وَإِنَّمَا كَفُورًا، (دہر: ۱)
ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا، (اب وہ) یا شکر گزار
دشکر کرے یا ناشکر (کافر) ہو گیا
اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہیں بڑھائیں گے، اور اگر ناشکر
دکفر، کی تو بیشک میرا غضب بہت سخت ہے۔
إِن عَذَابِي لَشَدِيدٌ (ابراہیم: ۲)

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کی نافرمانی کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے، تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے، حضرت ابراہیم کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے:

إِنَّ ابْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا
لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَوْ يَرَى الْكُفْرَ مِنْ
الْمُشْرِكِينَ شَاكِرًا لَوْ نَعِمَهُ
اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ
مُسْتَقِيمٍ (نحل: ۱۶)

دراصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا
فرمانبردار اسکو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والوں میں
سے نہ تھا، اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکر گزار، اللہ
نے اُسکو چُن لیا، اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکر گزاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے،
احکام الہی کی پیروی کی جائے اور شرک سے پرہیز کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل
میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جز، دین کی اصل اور اطاعت الہی کی بنیاد ہے یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر
مندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہوتی چاہیے، اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قوی و عملی
اظہار کا نام شکر ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ
وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا (نساء: ۲۱)

اگر تم شکر کرو، اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دیکر کیا کرے گا
اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے اب رہا شکر
تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے، ساری عبادتیں شکر ہیں، بندوں کے ساتھ حسن و سلوک اور
نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے، تو یہ دولت
کا شکر ہے، صاحب علم اپنے علم سے بندگان الہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور کمزوروں
کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکر ہے، الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک
شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لیے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان
ہوں گے، تو یہ کہا:

وَلَا تَحْجِدْ أَكْثَرُهُمْ شَاكِرِينَ (اعراف: ۲)

تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔
خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا:

وَسَجَّزِي الشَّاكِرِينَ (ال عمران: ۱۵)

اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دیں گے۔
یہ بوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے:

بَلِ اللَّهُ فَاعْبُدْ، وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ (زمر: ۶)

بلکہ اللہ کی بندگی کرو، اور شکر گزاروں میں سے ہو۔
شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں کبھی اُس کا بدلہ

دیکھو اس قرض کو اتار دیتے ہیں، زبان سے اس قرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے
جسکے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہی سبب ہے کہ حمد الہی میں اللہ تعالیٰ کے ان صفات کا ذکر ہوتا ہے جو
ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں، اور اسی لیے یہ کہنا چاہیے کہ جس طرح سارے قرآن کا پختہ

سورہ فاتحہ ہے، سورہ فاتحہ کا پختہ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر تیسرا ن پاک کا آغاز سورہ فاتحہ ہے، اور سورہ فاتحہ
کا آغاز الحمد ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (فاتحہ: ۱)

سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔
جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور جمادات ہیں، سب کی پرورش، اور زندگی اور بقا اسی
ایک کام ہے، اسی کے سارے وہ جی رہے ہیں، اور نکھر رہے ہیں، اس لیے حمد اسی ایک کی ہے یہ تو دنیا کے نیک نیک قدرت کا آغاز
ہے لیکن دنیا جب اپنی تمام منازل حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی، اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین
اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے، پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا
چکے گا یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہل جنت، جنت میں اور اہل دوزخ، دوزخ
میں جا چکیں گے، وہ وہ وقت ہوگا جب دنیا اپنے اُس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی، جس کے لیے خدا نے اس کو بنایا
تھا، اس وقت عالم امکان کے ہر گوشہ سے یہ سُری آواز بلند ہوگی:

وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (زمر: ۸)

سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔
حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے:

أَلَمْ نَكْمُلْ فِي الْسَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (بقرہ: ۲۱)

اُسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔
فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں:

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ
حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (مومن: ۱)

جو عرش کو اٹھاتے ہیں، اور جو اس کے چاروں طرف
ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔
بلکہ عرصہ وجود کی ہر چیز اس کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے:

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ (بنی اسرائیل: ۵۱)

اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔
یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے:

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ دَجْرًا وَنَهَارًا (طور: ۱۳)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں میں ہنسا کھانا کھانے

کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سوکر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، طہارت خانے سے نکلنے کی وغیرہ وغیرہ
ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکر یہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکر یہ
دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہیے،

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں اُن کا شکر یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں
کی تعمیل میں لگا رکھیں اور اُن سے اُن کی خدمت کریں جو اس جسمانی نعمت کے کسی جز سے محروم ہیں، مثلاً جو اناج اور

معدور ہوں، بیماریا ہوں، کسی جسمانی قوت سے محروم ہوں یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ جو اس
نعمت سے بے نصیب ہوں، اُن کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، پیاسوں کو پانی پلایا جائے، ننگوں

نعمت سے بے نصیب ہوں، اُن کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، پیاسوں کو پانی پلایا جائے، ننگوں

کو کپڑا پہنا یا جائے، بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے۔

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لیے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے:

تَبْرُكُ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا، وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِيَمَنَ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا، (نفرقان: ۶۱)

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے، یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں، اور دن کی روشنی اور چاند کے اُجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں جس کے لیے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں، دوسری آیتوں میں ہے:

الترجيمُ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نُصْلَةَ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ، ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ.

(رحمہ: ۱۰)

والله أَخْرَجَكُمْ مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا، وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ، (نحل: ۱۱)

ان آیتوں میں خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان ہے اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے، یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں اور یہ سمجھیں کہ جسے یہ زندگی دی، اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنا دیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے اور ہمیں بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے اور پھر ہم تھپاؤں اور آنکھ کان سے اسکے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں، بعض اور آیتوں میں ہے:

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذَلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

(سج: ۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ، (بقرہ: ۲۱)

فَكُلُوا مِن مَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَ

اشْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ إِن كُنْتُمْ

إِنسَاء تَعْبُدُون، (نحل: ۱۵)

تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں

ان کو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم

اُسی کو پوجتے ہو۔

یہ مالی نعمت کا بیان تھا اس کا شکر یہ بھی خدا کو مان کر مال کے ذریعہ ادا کریں۔

دنیا میں شکر یہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکر یہ ادا نہیں کیا جاسکتا اس تیسری قسم کے شکر یہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں، اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے،

وَإِحْسِنُ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ (قصص: ۸) اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر۔

اسی کا نام خدا کو قرض دینا بھی ہے، ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں کہ اسکو کوئی قرض دے، خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اسکے ضرور مند بندوں کو یا قابل ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے، ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِي يُقرضُ اللَّهُ قَرْضًا حَسَنًا

کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔

(بقرہ: ۲۲۰، حدید: ۲)

وَاقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا (حدید: ۲، منزل: ۲)

اور خدا کو قرض حسنہ دو

ان قرضو اللہ قرضًا حسنًا (تغابن: ۲)

اگر خدا کو قرض حسنہ دو گے۔

خدا کو قرض حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اس کی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیے۔

حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائے گا، اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کے گا اے میرے پروردگار تو تو جہان کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائے گا کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی پرسش نہ کی، اور اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر خدا فرمائے گا، اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے جہان کا رب ہے، میں تجھے کیسے کھاتا، فرمائے گا، تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرا فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے اس کو نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ کے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے میں تجھے کیسے پاتا، فرمائے گا میرا فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے اس کو نہیں پلایا، اگر تو اسکو پلاتا تو آج تو اسکو میرے پاس پاتا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی و مالی شکر یہ ہم کو کس طرح ادا کرنا ہے اور اس کا قرض ہم کو کیونکر اتارنا چاہیے۔

لے صحیح مسلم باب فضل عیادة المرین :

خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہو گئی، ان صفحات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ انہوں نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے توہرے توہرے چاک کر دیئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جز ہے اس کی حقیقت کتنی واضح کر دی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائے، اور آپ نے وہ انسانوں کو بتائے، وہ کتنے مکمل اور انہیں ایک ایک آئینہ آپ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل، اور دین و دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے اور آپ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روج کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے، عملاً صاف، واضح اور متعین ہے، اور زمانہ نابعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے متبرک ہے، اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوع انساں کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے، اس لیے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہیے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا، جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا

صَلَوَاتُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَبَرَكَاتُهُ

مغفرت کا طلب گزار
سید سلیمان ندوی
سنہ ۱۳۵۳ھ
۱۲ جمادی الثانیہ

عرض ناشر

اس جلد کے آخر میں ایک ضمیمہ تھا، اب جدید کتابت میں اس کی تمام عبارتیں کتاب کے اندر اصل مقامات پر کتابت کرا دی گئی ہے فقط ناشر

الْحَمْدُ لِلَّهِ سِيرَتِ النَّبِيِّ ﷺ جلد پنجم ختم ہوئی

اس دعا میں بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر میں، شکر کے دلی جذبے کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو۔ دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گزار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائیں گے میں ان کے لیے اپنی نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لیے اپنے عمل میں سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب میں اس کو نئی نئی نعمتیں اور عنایت ہوتی جاتی ہیں، اسی لیے فرمایا:

لَٰسَ شُكْرُكُمْ لَآ يَزِيدُ تَكْوِيْنًا وَلَٰسَ كَفْرُكُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراہیم: ۲۰)
اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہیں جس نے شکر کیا۔
وَ سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَہٗ مَا یَشَآءُ (مر: ۲۰)
اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے لیے اس کو کسی اور تمبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کو مانے گا اور اس کے حکموں پر چلے گا، اور اسی کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلائی کریگا، اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کریگا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود آپس میں ایک دوسرے انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گزاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گزاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا: **لَا یُشْکِرُ النَّاسَ اِلَّا بِشُکْرِ اللّٰهِ** (ترمذی کتاب البر والصلۃ) یعنی جو انسان کو شکر ادا نہ کرے گا، وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا، اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکر ادا نہ کرے گا، تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکر یہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

www.muhammadilibrary.com